راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر : حسن عباسی

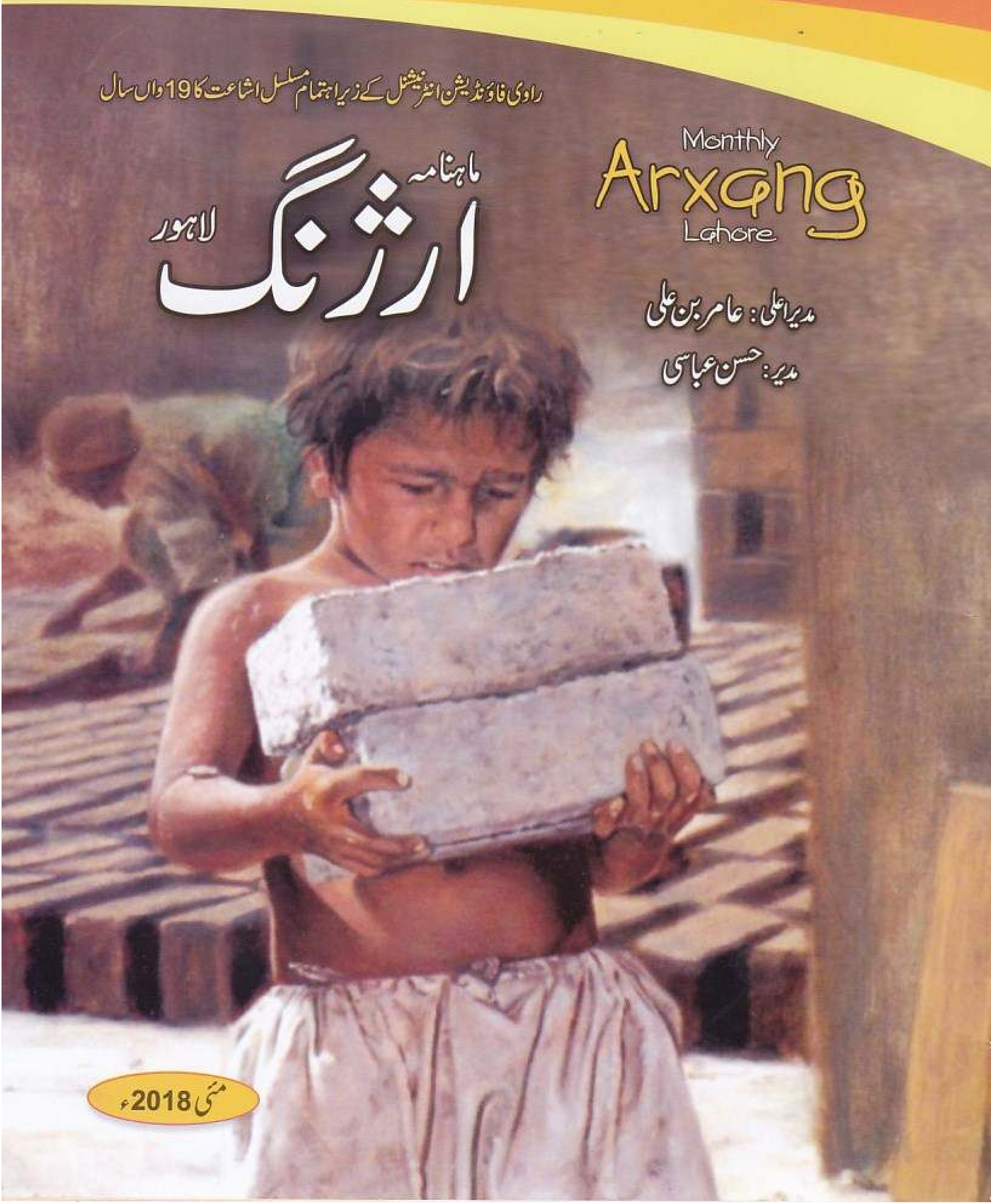

مئی 2018ء

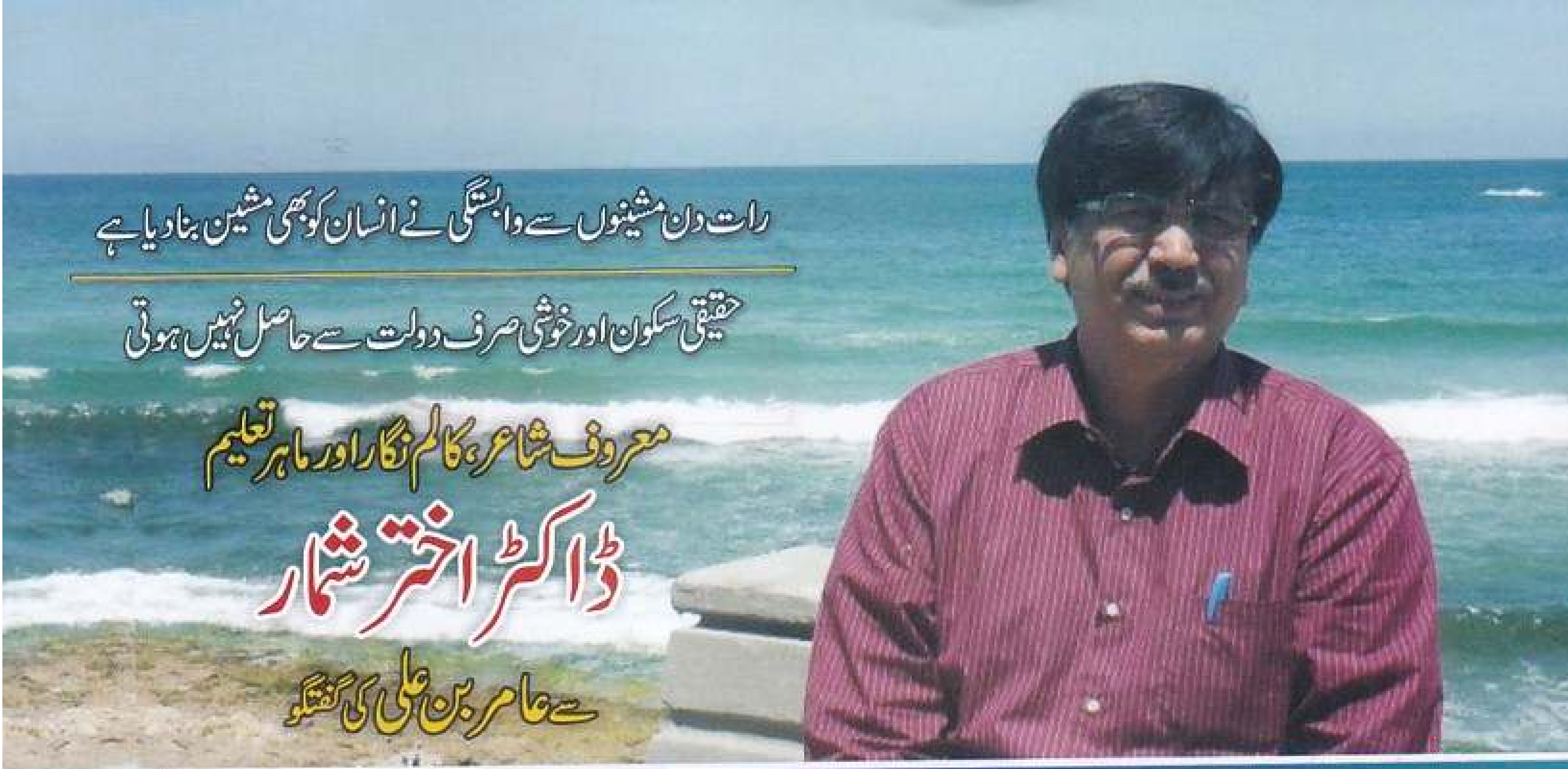

رات دن مشینوں سے وابستگی نے انسان کو بھی مشین بنادیا ہے

حقیقی سکون اور خوشی صرف دولت سے حاصل نہیں ہوتی

معروف شاعر، کالم نگار اور ماہر تعلیم

ڈاکٹر اختر شمار

سے عامر بن علی کی گفتگو

اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ایک عجیب افراتفری، بے سکونی، حرص وہوس کا دور دورہ ہے

چیئرمین شعبہ اردو ایف سی کالج یونیورسٹی ڈاکٹر اختر شمار کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں آپ ایک منجھے ہوئے شاعر، محقق، استاد ادب، کالم نگار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو شعری روایت میں "دلیری" سے مکالمہ کرنے اور محبت کی عظمت کو اجاگر کرنے کے ساتھ، کیفیاتِ دل کی "کوملتا" کو شاعری سے ہمکنار کرنے میں ایک انفرادی لب ولہجہ متعارف کرایا ہے۔ اب تک ان کے ۸ شعری مجموعے ادبی حلقوں اور بین الاقوامی سطح پر قارئین میں متعارف ہو چکے ہیں اور ان کے لاتعداد اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں، اردو کے علاوہ پنجابی شاعری کے دو، کہانی اور اردو پنجابی کالموں کے چار مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ سفرنامہ، تحقیق، تصوف پر بھی ان کی کتب مقبول ہوئیں۔ مختلف قومی روزناموں میں ان کے کالم شائع ہوتے ہیں، اس وقت روزنامہ نئی بات میں کالم کے علاوہ ادبی ایڈیشن بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ادب میں آپ کی بھرپور کنٹری بیوشن ہی کے سبب ہم آج ڈاکٹر اختر شمار سے ایک بھرپور مکالمہ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ جس میں زندگی کو بالکل نئے انداز میں ڈسکس کیا گیا ہے۔

س : جی ڈاکٹر صاحب، بہت شکریہ وقت دینے کا، ہمیں علم ہے آپ کی بے پناہ مصروفیات ہیں، پہلے مختصراً اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بیان کریں تا کہ قارئین مکمل آپ سے متعارف ہو سکیں؟

ج : جی بسم اللہ۔۔ میری ولادت راولپنڈی میں ۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء کو ہوئی، والد صاحب پاک فوج میں صوبیدار تھے، بنیادی طور پر ہمارا گھرانہ کاشتکار تھا مگر بارانی زمینوں کی فصلوں کا دارومدار بارشوں پر ہوتا ہے سو

اس علاقے کے لوگ زیادہ تر آرمی جائن کر لیتے ہیں ویسے بھی آرمی کی سروس کو اس علاقے میں باعث عزت بھی سمجھا جاتا ہے۔ میرے بھائی بھی آرمی میں رہے ہیں۔ باقی اب بھی اس علاقے میں ہمیں اچھا خاصا زمیندار خیال کیا جاتا ہے مگر بنجر اور پتھریلی زمینوں کا۔ دادا جان نے کچھ زمین کاشت کے قابل بنائی تھی جو اس وقت میرے بھانجوں کی نگرانی میں ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی پھر ہم ملتان آگئے کہ والد صاحب آرمی سے سبکدوش ہو کر کھاد فیکٹری میں جاب کر رہے تھے سو بی اے تک ملتان میں پڑھتا رہا۔ اسی زمانے میں شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا، بیدل حیدری صاحب اس دور میں نوجوان شعرا کی ادبی تربیت کرتے تھے، اپنے پہلے ادبی دوست اطہر ناسک کی وساطت سے میں بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوا۔ الحمد للہ اب تک انہیں شاعری میں استاد سمجھتا ہوں جبکہ کتنے ہی شعرا ان سے تربیت لینے کے باوجود بھی انہیں اون نہیں کرتے۔ شوکت مہدی میں اور اطہر ناسک باقاعدہ بیدل صاحب کے فارغ التحصیل شاگرد ہیں۔

س : بیدل حیدری صاحب کے حوالے سے ایک نوجوان فیس بک پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے؟ آپ کا تذکرہ بھی کرتا ہے، کہ آپ نے بیدل صاحب کا مجموعہ اب تک دبا رکھا ہے جو انہوں نے شائع کرنے کی غرض سے آپ کو دیا تھا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج : جی مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک نوجوان اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے کبھی کوئی جواب نہیں دیا صرف ریکارڈ کی درستی کے لئے چند باتیں ضروری

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 — مئی 2018 — شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (جاپان)

محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ نازاو کاڑوی

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 نوڈ گرافر ● نعمان حسن :0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ../ ، ۲

مضامین:

○ علامہ اقبال اور بندۂ مزدور / ڈاکٹر مختار عزمی ، ۳
○ انقلابِ فرانس، رومانوی تنقید اور ورڈز ورتھ/ظفر سپل ، ۶
○ مدینہ یاد آتا ہے...... میری نظر میں / صاحبزادہ رشید عثمانی ، ۱۱
○ عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے / شہزاد بیگ ، ۱۲
○ امکانات کا شاعر...... کاشف حسین غائر / شاعر علی شاعر ، ۱۳
○ قلندر کی صدا...... دکھی انسانیت کی پکار / جاوید قاسم ، ۱۵
○ لبنیٰ صفدر کی شاعری میٹھی اور سریلی آواز / ریاض ندیم نیازی ، ۱۶

شعری گوشے:

○ افضال نوید، ڈاکٹر مختار عزمی، ڈاکٹر فیصل کمال حیدری،
نبیل نجم، اعظم سہیل ہارون ۱۷ تا ۲۱

افسانے

○ ہم تیری نگریا میں آئے / نیلم احمد بشیر ، ۲۲
○ دھوکا / تسنیم کوثر ، ۲۶
○ مہلت / شہزاد تصور ، ۲۸

سفرنامہ

○ ...... تا سرزمین ترکی / ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ، ۳۲
○ سری لنکا - امن اور خوشحالی کی راہ پر گامزن / عامر بن علی ، ۴۶
○ شاعری ، ۵۰
○ بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر اختر شمار ، ۵۳
○ انٹرویو: انیلہ بھلر ، ۵۶

مختصر ادبی خبریں ، ۵۷
تبصرہ کتب ، ۵۸
نامہ ہائے احباب ، ۵۹

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد، نعت، سلام

حمد

یارب نہ دل میں آرزو لعل و گہر کی ہے
مجھ کو تلاش ہے تو متاعِ ہنر کی ہے
گزرے نہ ایک پل بھی تری یاد کے بغیر
بس ایک ہی طلب مری فکر و نظر کی ہے
ہر پل ہو میری آنکھ ندامت سے اشک بار
بس آرزو یہی مرے دامانِ تر کی ہے
دیتا ہے تو ہی طاقتِ پرواز بالیقیں
ورنہ کہاں مجال مرے بال و پر کی ہے
تو برگ و بار دے مجھے کٹنے سے پیشتر
میری مثال تو کسی بوڑھے شجر کی ہے
درپیش آخرت کا سفر ہے مرے کریم
تشویش دم بہ دم مجھے زادِ سفر کی ہے
اس کائنات کا ہے وہ بے تاج بادشاہ
یہ کائنات ساری اُسی تاجور کی ہے
حیرت سے آسمان پہ خورشید کو نہ دیکھ
تخلیق وہ بھی خالق شام و سحر کی ہے

خورشید بیگ میلسوی/ملیسی

نعت

لے جائے مجھے قسمت اُن رہ گزاروں میں
جنت کی جھلک دیکھوں طیبہ کے نظاروں میں
توصیف بیاں اُنؐ کی اک میں ہی نہیں کرتا
ہے مدح و ثنا اُن کی قرآن کے پاروں میں
آقاؐ تمہیں بخشا ہے جو حسن مرے رب نے
وہ حسن بھلا کب ہے ان چاند ستاروں میں
اکرام و عنایت کی ہے چشمِ کرم سب پر
ہر ایک بشر شامل ہے آپؐ کے پیاروں میں
ہر گوشۂ عالم سے، زائر تری دھرتی پر
آتے ہیں قطاروں میں جاتے ہیں قطاروں میں
سینوں میں محبت کے مہ تاب کیے روشن
جینے کے قرینے بھی سمجھائے اشاروں میں
اس کو بھی حضوری کا پیغام عطا کر دو
شامل ہے ندیم آقا! توصیف نگاروں میں

ریاض ندیم نیازی/سبی

نعت سیّد المرسلین ﷺ

نوعِ انساں کو ملا رنگِ اخوت تجھ سے
وہی اللہ کا ہوا جس کو ہے اُلفت تجھ سے
تیرا مداح خدا تیرے فرشتے درباں
کو بہ کو نام ترا سب کو ہے نسبت تجھ سے
ماسوا اللہ تیری ذات کا جلوہ ہر سو
تا بہ قوسین فروزاں ہے یہ رفعت تجھ سے
تیرے انوار کی کرنوں سے بنے شمس و قمر
کہکشاں قوسِ قزح بکھری ہے ندرت تجھ سے
میں گنہگار سہی پھر بھی ثناخواں ہوں ترا
میں سزاوارِ جناں ہوں کہ ہے الفت تجھ سے
حور و غلمان جناں کوثر و تسنیم سبھی
اس کے ہو جاتے ہیں ہو جس کو محبت تجھ سے
تیرے حسنین ہیں جنت کے جوانوں کے رئیس
آلؑ سے پیار کریں جن کو ہے اُلفت تجھ سے
کہہ دیا حق نے رفعنا لک ذکرک تجھ کو
روزِ محشر ہو عطا رافت و شفقت تجھ سے
تیری سیرت تیری صورت تیری عظمت پہ نثار
مجھ سے عاصی کو ہے اُمید شفاعت تجھ سے
ہے دعا شفقت نقوی کی بصد عجز و نیاز
آل کے صدقے ملے عقبیٰ میں راحت تجھ سے

سیّد شفقت حسین نقوی/میاں چنوں

سلام

زمانہ دیکھ رہا ہے یہ خار زار کی شام
بپا ہے گھر میں مرے جبر و اقتدار کی شام
شدید پیاس بھرا دن گزر نہیں پاتا
طویل ہونے لگی ہے یہ ریگ زار کی شام
گئی نہیں ہے ابھی آگ دشت سے باہر
ڈھلی نہیں ہے ابھی رنج بے شمار کی شام
دعائیں دیتا ہے صحرا حسینؑ والوں کو
نثار ہوتی ہے ان پر کڑے حصار کی شام
مہک رہا ہے زمینوں پہ گر کے پاک لہو
چمک رہی ہے ابھی تیغ آبدار کی شام
امامِ عصر کے ہمراہ سجدہ ریز ہوئے
وہ اعتماد کا دن اور وہ اعتبار کی شام
یہ شام دسویں صحرا کی شام ہے کامی
سو خود بھی راز ہے کوئی یہ رازدار کی شام

سیّد کامی شاہ/کراچی

علامہ اقبال اور بندۂ مزدور

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

علامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر اور شاعری میں بندۂ مزدور کے مقام و مرتبہ کا جائزہ لینے کے لئے ''اقبالیات'' کے ناقدین سے رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کسی مفکر، شاعر یا فنکار کی بہتر تفہیم کر کے اسے عام لوگوں پر منکشف کرتے ہیں لیکن اقبال کے ناقدین اور شارحین میں بہت سے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس سے فکرِ اقبال کی وسعت و عظمت بھی ظاہر ہوتی ہے مگر مجھ ایسے طالب علم کے لئے الجھاؤ کا باعث بھی بنتے ہیں۔ یہی مشکل اس مضمون کی ترتیب میں بھی پیش آئی۔ چنانچہ میں نے افراط و تفریط سے بچ کر براہِ راست اقبال سے باتیں کر کے گوہرِ مقصود حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ نقادوں نے ضمنی مباحث میں الجھانے کی کوشش کی مگر میں انہیں ہوں ہاں کرتا رہا ہوں۔ جب اقبال سامنے ہو تو دوسروں کی بات کو ثانوی حیثیت ہی دی جانی چاہیے۔

نظریۂ وطنیت کی طرح، اقبال کے دوسرے نظریات کے دائرے بھی کبھی پھیلتے اور کبھی سکڑتے رہے ہیں جو کہ ان کے متحرک اور ارتقائی ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم بندۂ مزدور کے حوالے سے اقبال کی سوچ کا دائرہ ہمیشہ پھیلتا ہی رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس دائرے کا محیط وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں ''علم الاقتصاد'' کی اشاعت سے لے کر ۱۹۳۸ء میں ''ارمغانِ حجاز'' کے منظر عام پر آنے تک وہ تذکرۂ مزدور کو نہیں بھولے۔ ۱۹۰۴ء میں ''مخزن'' میں چھپنے والے مضمون سے لے کر اپنی وفات کے سال ۱۹۳۸ء میں، پیغامِ سالِ نو تک، بندۂ مزدور کا ذکر سانس کی ڈور کی طرح قائم رہا۔

برصغیر میں اقبال سے پہلے کسی فکری شاعر نے مزدور اور مظلوم طبقات کے بارے میں ایک مربوط، متعین اور منظم فکر کے طور پر کچھ نہیں لکھا۔ کسی کے ہاں ایک شعر، کسی کے ہاں دو یا زیادہ سے زیادہ دو چار نظمیں نظر آ سکتی ہیں۔ اقبال وہ واحد عظیم المرتبت فکری شاعر ہے جس نے مزدور کے پسینے کو اپنے اشعار میں جذب کر کے اسے مشکِ نافہ بنا دیا۔ ان کی دردمندی میں محنت کی مہک اور مزدور کے لہو کی باس موجود ہے۔ معروف ترقی پسند دانشور سجاد ظہیر لکھتے ہیں۔

''اقبال ایک پسماندہ، نو آبادیاتی معاشرے میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے عالمی استعمار کے خلاف جس انقلابی وژن سے کام لیا اور جس تخلیقی انداز سے نو آبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کی، افرو ایشیائی اقوام کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔''(۱)

محمد علی صدیقی نے بھی ''توازن'' میں بدرالدین شکیب کے حوالے سے اس امر کی تائید کی ہے۔ انہوں نے ان نامور ہندوستانی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے شروع میں یورپ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ سب لوگ مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا احساس لے کر لوٹے۔ اقبال نے مغرب سے مرعوب ہونے کی بجائے اس کے کھوکھلے پن کا سراغ لگایا۔ شاخِ نازک پر آشیانہ بنانے والوں کے سامنے اس کی ناپائیداری کا کھلم کھلا اعلان کر دیا حالانکہ اس وقت سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اگر ہم ارتقائی لحاظ سے اقبال کے ہاں غمِ مزدور یا مظلوم لوگوں کی حالتِ زار کا نقشہ دیکھنا چاہیں تو سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں ''نالۂ یتیم'' سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نظم میں پوشیدہ کرب ۱۹۰۱ء ہی میں ''علم الاقتصاد''(۲) کی صورت میں ایک ٹھوس نثری احتجاج بن جاتا ہے۔ اس میں اقبال اس درد اور احساسِ زیاں کی عکاسی کرتے ہیں جو اس وقت کے مزدوروں اور کسانوں بلکہ پورے ہندوستان پر مسلط تھا۔ آگے چلیے تو ایک عہد آفریں رسالے ''مخزن'' (۵۔۱۹۰۴ء) میں ان کا ایک بصیرت افروز مضمون ملتا ہے۔ اس میں کشتگانِ جبر اور اسیرانِ استحصال کی زبوں حالی پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں

''......یہ قوم) اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے---------میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی دولت خیال کرتا ہوں----میری نگاہ میں اس بڑھئی کے کھردرے ہاتھ ان نرم و نازک ہاتھوں کی نسبت بدرجہا بہتر، خوبصورت اور مفید ہیں جنہوں نے قلم کے سوا کسی چیز کا بوجھ محسوس نہیں کیا۔''(۳)

۸۔۱۹۰۵ء حقیقت میں حیاتِ اقبال کا وہ دور ہے جب قیامِ یورپ میں ان کے افکار مغربی مقتضیات کی روشنی میں از سرِ نو تشکیل پاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ یورپ کے معاشی ہتھکنڈوں اور سیاسی شکنجوں کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی چمک ان کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کر سکتی۔ وہاں ترقی یافتہ سوسائٹی کے اندر چھپے کرب کو بخوبی دیکھ لیتے ہیں۔ قیامِ یورپ کے دنوں کی ایک نظم ''انسان'' ہے میں انسانی تنہائی اور رشتوں کی پامالی کا نوحہ دیکھئے۔

کوئی نہیں غمگسار انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

اقبال ان لوگوں سے پیار کرتے ہیں جو اللہ کے بندوں سے پیار کرتے ہیں اور مزدور، کسان اور غرباء ہی تو ہیں۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد، اسی خیال کو نظم ''جواب شکوہ'' ۵ میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔

امراء نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غرباء کے دم سے

اسی زمانے میں ایک اور معرکۃ الآراء نظم ''شمع و شاعر'' میں بھی استعاراتی انداز میں مظلوموں اور مجبوروں کی کم نصیبی کا ذکر ملتا ہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

یہاں 'دہقان' سے مراد ہندوستان کا زوال پذیر مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور دہقان مزدور بھی۔ اقبال نے یہی اسلوب نظم ''بڈھے بلوچ کی نصیحت'' میں بھی برتا ہے۔

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا، وہ کیسا دہقان

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ فکرِ اقبال میں مزدور سے مراد صرف اینٹیں اور گارا ڈھونے والے محنت کش ہی نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسمیں وہ تمام محنت کش طبقات شامل ہیں جو اجرت کی بنیاد پر کام کرتے ہیں اور آجر اور اجیر کے متعین مفہوم میں شامل ہیں۔ وہ مجبور کسان جسے کھیت میں فصل اگا کر دو وقت کی روٹی بھی نہ ملے، وہ مزدور جسے کپڑا بن کر اپنا کفن بھی نصیب نہ ہو اور جسے کدال، تیشہ یا قلم چلا کر بھوک کے عفریت سے لڑنا پڑے، وہ مزدور ہے۔ ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ اقبال کا بندہ مزدور، اس کے باقی نظامِ فکر کا ایک حصہ ہے۔ وہ جہاں بندۂ مزدور ہے وہاں وہ بندۂ مومن کا پرتو بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ نانِ جویں پر گزارا کرتا ہے۔

۱۹۱۰ء میں اقبال نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اصحاب فکر و نظر اور طلباء کے سامنے ایک خطبہ پیش کیا۔ عنوان تھا ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر''۔ اس میں وہ وطن کی غربت اور افلاس پر لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''سب سے اہم عقیدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی تمام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کران اسباب کا پتا لگائے جنھوں ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔''(۴)

کلامِ اقبال میں بندۂ مزدور کے حوالے سے ایک واضح جھلک نظم ''خضر راہ'' میں ملتی ہے۔ اس نظم میں اقبال کی فکری تمازت شعلہ آفریں ہو جاتی ہے اور یہ موضوع جامعیت اور آفاقیت حاصل کر لیتا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

''خضرِ راہ'' سے اقبال کی انقلابی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے ان کی شاعری کا ایک بڑا اہم موضوع طبقاتی کشمکش اور سرمایہ و محنت کی آویزش ہے''(۵)

۱۹۱۷ء میں انقلاب روس عوامی جدوجہد کا ایک تاریخی ماحصل تھا۔ یقیناً اقبال بھی اس متاثر ہوئے۔ وہ جان گئے کہ اب محنت کشوں کی اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے اور استحصال کی اندھی طاقتوں کا زوال قریب ہے۔ چنانچہ انہوں نے بندۂ مزدور کے لئے زیادہ شدت کے ساتھ آواز بلند کی۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

آدم سمتھ آزاد معیشت کا سب سے بڑا حامی تھا مگر اسے بھی یہ شکایت رہی کہ سرمایہ دار اور بورژوا طبقے مظلوم لوگوں کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں کارخانہ داروں نے مزدوروں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے، اس کے ردِعمل کے نتیجے میں اشتراکیت کا نظریہ مقبول ہوا۔ کارل مارکس کہتے ہیں ''اس سرمایہ داری نے انسان اور انسان کے درمیان سوائے ننگی مفاد پرستی اور سوائے زہرناک زرگری کے کوئی رشتہ باقی نہیں رہنے دیا۔'' اقبال سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان جنگ میں روسی انقلاب کی فتح دیکھ رہے تھے۔ وہ مظلوم طبقات کو پیغام دیتے ہیں۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مزدور کی تباہ کاری کے لئے فکرِ مغرب نے تین محاذ کھول دئے۔ سرمایہ داری، مذہب اور جمہوریت۔ مئوخرالذکر دوتوں کو منفی انداز میں پیش کیا گیا۔ اس طرح ان تینوں محاذوں سے مزدوروں کا استحصال کیا گیا۔

''پیامِ مشرق'' ۱۹۲۳ء میں منظرِ عام پر آتی ہے۔ اس میں نغمۂ مزدور کی لے تیز تر ہو جاتی ہے۔ نظم ''محاورہ مابین حکیم فرانسوی آگسٹس و مردِ مزدور'' میں مزدور اس قفس سے باہر نکل آتا ہے جسے ''خضرِ راہ'' میں وہ اپنے لئے آشیاں سمجھتا تھا۔ مزدور اعلانِ جنگ کرتے ہوئے کہتا ہے

بدوشِ زمیں بوجھ سرمایہ دار

ندارد گزشت از خورو خواب کار

''قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور'' میں اقبال نے سرمایہ دار کی روایتی عیاری اور چالاکی کا پردہ چاک کر دیا ہے۔سرمایہ دار کس طرح سارے وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے،اور مزدور کو خوش کن خوابوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔اس طنزِ لطیف کی مثال دیکھئے۔

این خاک آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وزخاک تا بہ عرشِ معلا از آنِ تو

''پیام مشرق'' ہی کی ایک اور اہم نظم 'نوائے مزدور' ہے جسے خلیفہ عبدالحکیم نے محنت کشوں کا پیغامِ انتقام کہا ہے۔کھدر پوش مزدور جدّ وجہد کے ساتھ سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔

زرہزنانِ چمن ، انتقام لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

فکرِ اقبال میں بندۂ مزدور کا مقام اس قدر بلند ہے کہ اقبال کا کلام مزدور تحریک کا منشور کہا جا سکتا ہے۔مشرق ومغرب کے بڑے بڑے مزدور رہنماؤں کے برعکس،اقبال مزدوروں کے سامنے محسنِ آعظم ﷺ کا اسوۂ حسنہ پیش کرتے ہیں۔آپؐ نے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودی،اپنی مخالف بڑھیا کا بوجھ اٹھا کر اسے منزل تک پہنچایا اور مزدوری تک نہ لی۔آپ کی بیٹی کے ہاتھوں پر چکی پیستے پیستے سیاہ نشانات پڑ چکے تھے۔آپؐ ہی نے سب سے پہلے یہ قانون وضع فرمایا کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسے اس کی مزدوری دی جائے۔اقبال مزدوروں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ رزقِ حلال کمانے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔وہ نانِ نویں کے ساتھ بازوئے حیدرؓ کی دعا بھی کرتے ہیں۔وہ اسے فقرِ غیور کی طرف راغب کرتے ہیں کہ یہ فقر تن کے ساتھ من کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

' زبورِ عجم' میں ایک بہت مترنم نظم 'انقلاب۔اے انقلاب'' نظر آتی ہے۔اس میں نغمۂ مزدور ایک نئے آہنگ میں گایا گیا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز دلعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب......اے انقلاب

''بالِ جبرئیل'' کی تخلیق تک اقبال فکری اور فنی پختگی کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔اس تصنیف میں بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی پر احتجاج اور پھر کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے درودیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک اور نظم میں حقائق کی سنگینی اور لہجے کی تلخی دیکھئے

تو قادروعادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

بالِ جبرئیل ہی کی ایک اور نظم میں بندگانِ کوچہ گرد کی بے کسی کو بہت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

تیرے امیر مال مست ،تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی ،خواجہ بلند بلند بام ابھی

یہاں تو بندۂ مزدور منتظرِ روزِ مکافات ہے لیکن ''ساقی نامہ'' میں مزدور کی فریاد بابِ اثر پر دستک دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔پرانا نظام،سرمایہ داری دم توڑ رہا ہے اور نیا دور چہرہ کشا ہو رہا ہے۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر وسلطاں سے بیزار ہے

بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی کم کرنے کے لئے اقبال نے نہ صرف شعروادب کو استعمال کیا بلکہ عملی جدّ وجہد بھی کی۔اس سلسلے میں قائدِ اعظم کو خطوط بھی لکھے اور مسئلے کے حل کے لئے ابھارا۔جب اقبال پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو کسانوں پر لگائے جانے والے ناروا لگان کی سخت مخالفت کی اور دیہاتی عورتوں کے لئے طبی سہولتوں کا مطالبہ کیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کے عہدِ آغاز میں بارگاہِ خداوندی میں ایک دعا مانگی تھی

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ،ضعیفوں سے محبت کرنا .

ان کی ساری زندگی اسی دعا اور رزو کے سانچے میں ڈھلی رہی۔یہی دعا ان کی نظم ونثر میں ڈھل کر بندگانِ کوچہ گرد،غریبوں اور مزدوروں کے بہتر معاشی وقار کا مطالبہ کرتی رہی۔یہی دعا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان کی صورت میں مجسّم ہو کر دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئی۔-------اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں وہ صبح کب نمودار ہو گی جب یہی دعا مزدور کے ہونٹوں کا تبسّم بن جائے گی۔

(۱۹۷۸ء)

حوالہ حواشی:

۱۔سجاد ظہیر،سید،''روشنائی''،مکتبہ اُردو لاہور ۱۹۵۶ء
۲۔اُردو میں،معاشیات کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے
۳۔ماہنامہ مخزن،لاہور ۵۔۱۹۰۴ء
۴۔علامہ اقبال،''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' اقبال اکادمی لاہور۔۱۹۹۰ء
۵۔عزیز احمد'' ترقی پسند ادب'' ادارہ اشاعت اُردو،حیدر آباد ۱۹۴۵ء

انقلابِ فرانس، رومانوی تنقید اور ورڈز ورتھ

ظفر سپل

1789ء میں شروع ہونے والے انقلاب فرانس نے نئی دنیا، نئے انسان، نئے فلسفے، نئے خیالات اور نئے ادب کی تشکیل میں حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے!

یہ بڑے عجیب دن تھے!

ہاں یہ غیر معمولی دن تھے، جب شہروں کی گلیوں میں نعرہ زن، جوش سے ابلتے ہوئے عام شہریوں اور کھیتوں، کھلیانوں میں غیض وغضب سے بھرے ہوئے خستہ حال کسانوں نے مطلق العنان بادشاہت کے اس نظام کو فقط تین سالوں میں پانی کے بلبلے میں بدل دیا، جس نے صدیوں تک اس ملک پر راج کیا تھا۔ یہ محض ایک سیاسی انقلاب نہیں تھا، بلکہ پورا فرانسیسی معاشرہ تبدیلی کے ایسے عمل سے گزرا، جس نے جاگیردارانہ گرفت، روساء کے تسلط اور مذہبی اجارہ داری کو چشم زدن میں پیوند خاک کر دیا۔ پھر اس خاک کے خمیر سے وہ انسان برآمد ہوا جو آزادی کے مفہوم کی نئی تشریح کرنا چاہتا تھا اور پھر پرانی قدر کو ملیا میٹ کرنے پر کمر بستہ تھا۔

انقلاب فرانس دراصل امراء، روئسا اور طبقۂ خاص کے خلاف عوام کا انقلاب تھا۔ وہ طبقہ جو صدیوں سے تہذیب کے بوجھ تلے پڑا کراہ رہا تھا، ابھرا اور اس نے پرانی تہذیب، اس کی قدروں اور اصولوں کو رد کر دیا۔ اب نئے تصورات تھے اور نئے معیار، جنہیں آئندہ حکمرانی کرنا تھی...... قدما، امراء اور روساء کی جگہ عوام اور سادہ لوح دیہاتیوں نے لے لی۔ تو یہ لوگ وہ اصول، زبان اور لب ولہجہ تو نہیں رکھتے تھے جن کی پہچان قدما، روساء اور امراء کے دانش وروں کے حوالے سے کی جاتی تھی۔ ''کلاس'' ویسے بھی امراء کی لغت کا لفظ ہے۔ سو، کلاسیکیت اور اس کے اصول یہ کہہ کر رد کر دیئے گئے کہ یہ مصنوعی ہیں اور طبقہ خاص کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

چونکہ شہر کی گلیوں میں بسنے والے ادنیٰ کلاس کے لوگوں اور کھیتوں کھلیانوں میں کام کرنے والے کسانوں نے ایک مخصوص تہذیب سے نجات حاصل کی تھی، اس لیے انقلاب فرانس کے نمائندہ روسو نے لفظ ''تہذیب'' ہی کو عملاً رد کر دیا اور اس کے مقابلے میں ''نیچر'' کو ترجیح دیتے ہوئے نعرہ لگایا ''نیچر کی طرف واپسی'' (Back to Nature)...... یہ سب ایک نئے جہان کی نمود تھی۔ اب تہذیب کی کلاسیکیت کی جگہ نیچر کی فطری سادگی نے لے لی۔ چونکہ عوام کے لیے ''جذبات'' عقل سے زیادہ معنی رکھتے ہیں۔ اس لیے اس دور کا ادب عقل کی بجائے ''جذبات'' اور ''تخیل'' کی عملداری میں آ گیا۔ شہری زندگی کی بجائے دیہاتی زندگی ادب کا موضوع بن گئی اور قدما، امراء اور شرفاء کی زبان کی بجائے عوام او دیہاتیوں کی زبان ادب کا معیار قرار دے دی گئی...... یہ اس تحریک کے ابتدائی خدوخال تھے، جسے بعد میں رومانوی تحریک کے نام سے پہچانا جانا تھا۔ رومانیت کا لفظ رومانس (Romance) سے نکلا ہے اور رومانس کا اطلاق دورِ وسطیٰ میں عشق ومحبت کی ان کی پرشکوہ داستانوں پر ہوتا تھا، جن سے اولالعزم نوجوانوں کا پرخطر مہمات کے دوران واسطہ پڑتا تھا۔ شلیگل (Scheleqel) اور مادام ڈی سٹال (De Stael) نے اسے پہلی بار باقاعدہ ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا۔ مگر روسو کے اس جملے نے کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے'' نے ادب میں رومانیت کی تحریک کے مزاج اور سمت کے تعین کا عندیہ دیا۔

ظاہر ہے روسو تو خالصتاً سیاسیات اور عمرانیات کا آدمی تھا، مگر بعد کے ادیب جو پہلے ہی اس تشکیک میں مبتلا تھے کہ کہیں اصل زندگی کا شہر وہ تو نہیں جس کے دروازے پر کلاسیکیت دھرنا مارے بیٹھی ہے اور اس کے اندر جانے سے روکتی ہے، ان کے لیے پرانی روایات اور اصولوں سے انحراف کے لیے ایک جرات پیدا ہوئی۔ سو، رومانوی انسان کہنا شروع ہوا کہ انسانی ''جذبات'' ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر موجود ہیں اور ان پر واجب نہیں ہے کہ وہ عقل کے اصولوں اور سانچوں کی پابندی کریں...... اب جنون اور عشق اور جذبہ، عقل کی آتش نمرود میں بے دھڑک کودنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

جب بات یہاں تک پہنچی تو ضروری تھا کہ رومانیت کے لیے ایک جواز، ایک فلسفہ بھی فراہم کیا جائے۔ سو کہا گیا کہ عقل کی حیثیت چراغ راہ سے زیادہ نہیں ہے وہ اشیاء کی ظاہری شکل وصورت سمجھنے

میں تو مددگار ثابت ہوسکتی ہے مگر ایک ماورائی حقیقت بھی ہے جس تک پہنچنے کے لیے جذبات کی گرمی اور وجدان کی اڑان کی ضرورت ہے۔

ادب اور تنقید کے عہد رومانیت نے کلاسیکیت کے توازن اور میانہ روی کو مسترد کر دیا۔ رومانوی ادیب ہر جذبے کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کرتا تھا اور بے انت طاقت اور عظمت اس کا لوگو تھا۔ جب دریا کا پانی اپنے کناروں سے ذرا باہر آیا تو رومانیت نے ''آزادی'' کو اپنے منشور میں شامل کر لیا اور جب مروجہ اصولوں اور روایتوں کی زنجیریں توڑنے کا ذکر آیا تو اس منشور کے سرنامے پر ''انقلاب'' کا لفظ بھی درج کر لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ رومانیت کو (Cult of Energy) کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے چلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمات کو رد کیا جاتا ہے اور توازن کو خیرباد کہا جاتا ہے تو یہ اتنی سادہ بات نہیں ہوتی جتنی کہ نظر آتی ہے۔ انسان کی اندر ہی اندر شکست و ریخت ہوتی ہے۔ بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور ایک غیر معمولی کرب اور اداسی کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے۔ مگر رومانوی ادیب اس کو بھی ایک ''رومانس'' کے طور پر قبول کرتا ہے اور اس میں سے بھی لذت کشید کرتا ہے۔ سو رومانوی ادیبوں اور شاعروں نے کرب اور اداسی کو اپنی ذات کا جوہر بنا لیا۔ موت سے عشق کیا اور جواں مرگی کو سعادت زندگی قرار دیا۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ فلابیر (Flaubert) نے اپنی ایک دوست کو ایک خط میں لکھا:

''مجھے اپنے حواس سے لڑنے اور دل کو عذاب دینے میں لطف آنے لگا میں ان ساری انسانی لذتوں سے بے زار ہو گیا، جو مجھے میسر تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ اب طاقت اور غرور سے لبریز تھے اور میں نے جھنجھلا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے انسان کو اکھاڑ پھینکنا چاہا۔''

ان ساری چیزوں نے رومانیت کے ان رجحانات کی آبیاری کی، جس کے مطابق رومانوی ادیب تہذیب کے شکنجے سے آزاد ہو کر نیچر کی پرستش پر تلا ہوا تھا اور سادگی اور معصومیت کے گیت گانا چاہتا تھا۔ اسے تاریخ کے اساطیری کرداروں سے محبت تھی کیونکہ ان کی کہانیوں سے اس کے جذبات کو تسکین ملتی تھی۔ اسی حوالے سے آزادی، وطن پرستی اور انقلاب کی آرزومندی کو رومانوی تحریک کا آدرش قرار دیا گیا۔

اب نئے ادب، نئی شاعری اور نئی تنقید کے لیے رستہ صاف تھا اور اس بات کے لیے معاملہ آسان کہ کلاسیکی سانچوں میں تصرف کیا جائے، نئے معیار بنائے جائیں، موسیقی کے لیے نئے نوٹس (Notes) کی جستجو کی جائے، ترنم کے نئے اسالیب تراشے جائیں اور ناول، کہانی اور ڈرامے میں موضوع اور کرافٹ کے پرانے سانچوں کو توڑ کر نئی ہیئت کی تشکیل سازی کی جائے۔

......

فرانسیسی زمینوں میں جڑیں رکھنے والی رومانیت کو انگلستان کی فضاؤں میں پھلنے پھولنے کے زیادہ بہتر مواقع میسر آئے۔ یہ بات اس لیے بھی انگریز قوم کے مزاج سے لگا کھاتی تھی کہ ڈرائیڈن جیسے آدمی نے کلاسیکیت کو قبول کرتے ہوئے قومی حوالے کو مقدم رکھا تھا۔ خیر انگلستان میں دو نہایت اہم شاعر ورڈز ورتھ اور کالرج سامنے آئے اور انہوں نے رومانیت کی تحریک کو حقیقی پہچان اور معنویت عطا کی۔

ولیم ورڈز ورتھ (William Wordsworth) 7 اپریل 1770ء کو انگلستان میں پیدا ہوا اور 23 اپریل 1850ء کو ستر سال کی عمر میں اس رنگ و بو کے جہان سے رخصت ہوا۔ اس کے والد کا نام جون ورڈز ورتھ (John Wordsworth) اور ماں کا نام این ککسن (Ann Cookson) ہے۔ وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے اور خوب صورت شاعرہ ڈورتھی ورڈز ورتھ (Dorothy Wrodsworth)، جس کے وہ ساری عمر بہت قریب رہا، اس کی پیدائش کے ایک سال بعد پیدا ہوئی۔

اس کے باپ کا تعلق قانون کے پیشے سے تھا۔ وہ اگرچہ اپنے باپ کے زیادہ قریب نہیں رہا مگر بات یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے باپ کی لائبریری سے بہت استفادہ کیا اور یہ اُس کا باپ ہی تھا جس نے اسے شاعری کی ابجد سے واقف کیا اور اس کے باپ نے ہی اسے ملٹن، شیکسپیئر اور سپنسر سے متعارف کروایا۔

1778ء میں جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کے باپ نے اسے لنکا شائر (Lancashire) کے ایک گرائمر سکول میں داخل کرا دیا اور اس کی بہن ڈورتھی کو رشتہ داروں کے پاس یارک شائر (Yorkshire) بھیج دیا اور پھر دونوں بہن بھائیوں کی اگلے نو سال تک ملاقات نہیں ہوئی۔

ورڈز ورتھ نے 1791ء میں کیمبرج کے ایک کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ انہی دنوں وہ خوبصورت لینڈ سکیپ کی شہرت رکھنے والے مقامات دیکھنے کے خبط میں مبتلا ہوکر اٹلی اور سوئٹزر لینڈ گھومتا رہا۔ نومبر 1791ء میں اس نے انقلابی فرانس میں قدم رکھا اور یہاں پر قدم رکھتے ہی انقلاب فرانس اور ایک خوبصورت فرانسیسی لڑکی اینیتے ویلن (Annette Valon) کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ 1792ء میں اینیتے نے اس کی لڑکی کیرولین (Caroline) کو جنم دیا۔ ان دنوں فرانس اور انگلستان کے درمیان سیاسی تناؤ عروج پر تھا اور پھر کنگلے شاعر کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ اپنی محبوبہ سے شادی کی خواہش کے باوجود واپس انگلستان لوٹ آیا۔ پھر اگلے دس سال اس نے اینیتے اور اپنی بیٹی کی شکل نہیں دیکھی، مگر یہ درست ہے کہ وہ اینیتے اور کیرولین کو مالی طور پر سپورٹ کرتا رہا۔ دس سال بعد 1802ء میں اس نے اپنی بہن ڈورتھی کے ساتھ فرانس کا سفر کیا۔ اینیتے اور اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی ملاقات بھی ہوئی، بلکہ اس نے ماں اور بیٹی کی محبت میں ایک خوبصورت نظم بھی تخلیق کی مگر اس دفعہ یہ سفر حقیقتاً ایک اور لڑکی میری ہچن سن (Mary Hutchinson) کے ساتھ شادی کے معاملات طے کرنے کی غرض سے تھا۔

1793ء میں ورڈز ورتھ کا پہلا مجموعہ کلام سامنے آیا۔ 1795ء میں اس کی سمرسٹ (Somerset) میں اس شخص سے ملاقات ہوئی، جس کا نام اس کے نام کے ساتھ رومانوی تحریک کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہنا تھا۔ میری مراد کالرج سے ہے۔ 1797ء میں وہ اور اس کی بہن ڈورتھی سمرسٹ ہی اُٹھ آئے اور کالرج کے گھر سے چند میل کے فاصلے پر رہائش اختیار کی۔ پھر کوئی دن ایسا نہیں گیا جب دونوں دوستوں کی آپس میں ملاقات نہ ہوئی ہو اور انہوں نے اس ملاقات میں نئی شاعری پر گفتگو نہ کی ہو۔ اس طرح کے بحث ومباحثے کا نتیجہ اس مجموعہ کلام کی صورت میں نکلا، جسے رومانوی تحریک کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ یہ 1798ء میں نظموں کے مجموعے ''لیریکل بیلیڈز'' (Lyrical Ballads) کی اشاعت تھی، جو دونوں دوستوں کا مشترکہ تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1800ء میں شائع ہوا۔ اس پر بطور شاعر صرف ورڈز ورتھ کا نام درج تھا اور اسی ایڈیشن کے لیے ورڈز ورتھ نے وہ شہرہ آفاق ''دیباچہ'' (Perface) لکھا، جسے رومانوی تحریک کا منشور کہنا چاہیے۔

اس ''دیباچہ'' میں ورڈز ورتھ یہ انقلابی اعلان کرتا ہے کہ بادشاہوں، امراء اور نوابوں کا دور رخصت ہو چکا اور اس کے ساتھ ہی وہ شاعری بھی جو ان کی پسند اور ذوق کو مدنظر رکھ کر لکھی جاتی تھی۔ وہ دراصل کلاسیکی شعراء پر تنقید کر رہا تھا۔ سو اس نے کہا کہ کلاسیکیوں نے شاعری پر ایک مصنوعی خول چڑھا دیا تھا، جس کے خلاف بغاوت کرنا ضروری ہے۔

اس نے مزید کہا کہ ''خواص'' کی زندگی سے شاعری کے موضوعات اور مواد حاصل کرنے کی بجائے یہ سب اب ''عوام'' کی زندگی سے اخذ کر کے شاعری میں پیش کرنا ہوگا۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ مزید ایک دم آگے بڑھا اور کہا کہ میری مراد شہری زندگی سے نہیں بلکہ دیہات کی زندگی سے ہے کیونکہ ''نیچر'' کے قریب رہنے والا دیہاتی انسان شہری آدمی سے بہتر اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جب وہ یہ کہہ چکا تو اب اس کے لیے یہ تھیسس پیش کرنا نہایت آسان تھا کہ دیہاتیوں کی زبان ہی شاعری کے لیے موزوں ترین زبان ہے اور اسی حوالے سے زبان کا بہترین حصہ وجود میں آتا ہے۔

''دیباچہ'' ہی میں اس نے شاعری کے بارے میں اپنی معروف تعریف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''شاعری جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے۔ اسے نہ تو سیکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے کوئی متعین اصول ہیں۔'' شاعر کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ یہ وہ آدمی ہے جس کا ادراک زندہ ہے۔ جس کے جذبات دوسروں کی نسبت زیادہ قوی ہیں، جو فطرت کے قریب ہے اور یہ وہ آدمی ہے جو دوسرے آدمی سے باتیں کر رہا ہے۔''

شاعری کے مقصد کے حوالے سے اس کا نکتہ یہ ہے کہ شاعری نہ تو سماجی عمل ہے اور نہ اس کا کام علم دینا ہے۔ شاعری کا کام صرف یہ ہے کہ وہ فوری مسرت فراہم کرے، ہاں شاعری کو تمام علوم کی روح لطیف کہا جاسکتا ہے۔ ''دیباچہ'' میں ایک جگہ ورڈز ورتھ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ نظم ونثر کی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

پروفیسر ابر کرومبی (Abercrombie) کی کتاب ''اصول تنقید'' (Principles of Literary Criticism) کے حوالے سے رومانوی تنقید کے متعلق مختصر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارویں صدی کا شاعرانہ اسلوب اپنے ڈکشن

کے اعتبار سے اس لیےؔ اہم ہے کہ ان دنوں یہ عقیدہ رواج پا گیا تھا کہ خاص قسم کا ڈکشن ہی شاعری کے لیے موزوں ہے۔ مگر ورڈز ورتھ نے اپنے ''دیباچہ'' میں اس عالمگیر اصول کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کہا کہ فی نفسہٖ شاعرانہ ڈکشن کی قسم کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ شاعری کی موزوں زبان وہی ہے جسے لوگ واقعی بولتے ہیں۔ یہ اپنے طریق استعمال کی بنا پر ہی شاعرانہ بن سکتی ہے۔

1838ء میں ڈرہم یونیورسٹی نے اسے اعزازی ''ڈاکٹر آف سول لاء'' (Doctor of Civil Law) کی ڈگری سے نوازا۔ اگلے سال یہ عمل اکسفورڈ یونیورسٹی نے دہرایا۔ 1843ء میں رابرٹ ساوتھے (Robert Southey) کی وفات کے بعد اسے ''پوئیٹ لاریٹ (Poet Laureate) یعنی ''یعنی شاہی دربار کے شاعر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ابتدا میں اس نے یہ کہہ کر یہ اعزاز لینے سے انکار کر دیا کہ ''وہ اب بوڑھا ہو چکا ہے'' مگر جب اس وقت کے وزیر اعظم نے یہ کہا کہ ''اب قوم کو آپ سے اور کچھ نہیں چاہئے'' تو اس نے یہ اعزاز قبول کر لیا۔

وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب وہ تخلیقی طور پر دربار کی کوئی خدمت سر انجام دینے سے معذور ہے ......دراصل جدید نقادوں کے مطابق تو وہ 1810ء کے بعد سے ہی تخلیقی طور پر زوال کا شکار ہو گیا تھا۔ خیر معاملہ جو بھی ہو، 1847ء میں اس کی بیٹی ڈورا (Dora) کی وفات کے ساتھ ہی اس کی شاعری کے سوتے ہمیشہ کے لیے خشک ہو گئے۔

....

کولرج......رومانوی تحریک کے تذکرے میں ورڈز ورتھ جتنا ہی اہم نام......وہ 21 اکتوبر کو انگلستان کے شہر ڈیون (Devon) میں پیدا ہوا۔ یہ 1772ء کی بات ہے۔

بچپن میں حملہ آور ہونے والی بیماریوں نے اسے عمر بھر صحت مند زندگی کی آسودگی سے دور رکھا اور وہ زندگی کے آخری سانس تک بے چینی، اداسی اور ڈپریشن سے نبرد آزما رہا۔

اس کا والد جون کولرج (John Coleridge) ایک گرائمر سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ایک قابل عزت آدمی کی شہرت رکھتا تھا۔ کولرج اس شریف آدمی کی دوسری بیوی این باوڈن (Anne Bowden) کے بطن سے پیدا ہوا۔ ورڈز ورتھ کے برعکس کولرج اپنے شریف اور نیک والد کے بہت قریب تھا، جبکہ اپنی والدہ کے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ اور سرد رہے۔ شاید یہ ممتا کی گرم جوش آغوش سے دوری کا نتیجہ تھا کہ اس کے بچپن کو ایک توجہ کے طالب بچے کے بچپن کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ اس کو بچپن میں لڑکوں کے کھیلوں سے کوئی خوشی نہیں ملتی تھی۔

1791ء میں اس نے جیسس کالج (Jesus College)، کیمبرج میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ صحیح جا رہا تھا مگر دسمبر 1793ء میں اسے اس لڑکی، میری ایوانز (Mary Evans) نے مسترد کر دیا جس سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔ یہ ایک شاعر کو بد دل کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا اور کالج جانا چھوڑ دیا۔

یونیورسٹی میں قیام کے دوران اُس کی دوستی معروف شاعر رابرٹ ساوتھے (Robert Southey) سے ہوئی اور دونوں دوستوں نے دو بہنوں سے شادی کر لی۔ ساوتھے نے ایڈتھ (Edith) سے اور کولرج نے سارہ (Sarah) کے ساتھ لیکن حسب توقع کولرج کی اپنی بیوی سے نہ نبھ سکی۔ 1795ء میں کولرج کی ملاقات ورڈز ورتھ اور اس کی بہن ڈورتھی سے ہوئی۔ 1798ء میں ان دونوں کی مشترکہ تصنیف ''لریکل بیلیڈز'' سامنے آئی جس میں ورڈز ورتھ کی نظموں کی تعداد غالباً زیادہ تھی۔ بعد کے سال کولرج کے لیے زیادہ خوش کن نہیں ہیں۔ 1800ء کے بعد وہ زیادہ تناؤ کا شکار رہنے لگا تھا۔ اب اسے اس وہم نے آن گھیرا کہ اب اس کا شاعرانہ تخیل اتنا طاقتور نہیں رہا۔ سو اس نے افیون کے دامن میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا اور پھر جلد ہی اس گندے نشے کی مکمل گرفت میں آ گیا۔ اب معاملات مزید بگڑ گئے۔ ورڈز ورتھ کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا اور اس نے بیوی کو بھی طلاق دے دی۔

1810ء سے 1820ء تک کے درمیانی وقفے کو قدرے بہتر کہا جا سکتا ہے۔ اس دوران اس نے لندن اور برسٹل (Bristol) میں ملٹن اور شیکسپیئر پر بے شمار لیکچر دیئے۔ یہ گویا بجھتے ہوئے طاقتور چراغ کی آخری پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ 25 جولائی 1834ء کو افیون کا عادی نشئی اور شاعر بے مثال کولرج لندن میں انتقال کر گیا۔ دراصل اُس کے دل نے اس کے جسم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ورڈز ورتھ کے ''دیباچہ'' کے سترہ سال بعد کولرج کی تصنیف ''بائیو گرافیا لٹریریا'' (Biographia Literaria) سامنے آئی جس

میں اس نے ورڈز ورتھ کے عمومی خیالات سے اتفاق کیا۔ مگر جہاں جہاں اس نے محسوس کیا، وہ اپنے دوست سے اختلافات بھی کرتا ہے تاہم یہ بیحد ضروری ہے کہ رومانوی تنقید کی تفہیم کے لیے ورڈز ورتھ اور کولرج کو ایک ساتھ پڑھا جائے۔

کولرج کا پہلا اختلاف شاعری کی زبان کے حوالے سے سامنے آیا اور اس نے برملا کہا کہ دیہاتیوں کی زبان شاعری کے لیے غیر موزوں ہے اس لیے کہ دیہاتوں کے احساسات محدود ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسی معیاری روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان قرار دیتا ہے جو مفکروں کی زبان سے قریب تر ہو۔ وہ اس بات سے بھی انکار کرتا ہے کہ نظم اور نثر کی زبان ایک ہوتی ہے۔

کولرج نے محض ورڈز ورتھ کی لغزشوں کی اصلاح ہی نہیں کی، بلکہ رومانی نظریے کی وضاحت میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ کولرج نے ہی اس سوال کا جواب دیا کہ جب قدما کے اصول رد کردیئے جائیں تو پھر ادب کو پرکھنے کا کون سا ذریعہ رہ جائے گا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ شاعری کا مذاق بذات خود ایک طاقتور الہامی اور پراسرار طاقت ہے اور اچھی اور بری شاعری کی پرکھ میں دھوکا نہیں کھاتا۔ شاعر پیدائشی ہوتا ہے اور شاعری اس کی روح کے اندر موسیقی کی لہروں کی مانند ظہور کرتی ہے اور وہ اس کا اظہار عروض کے پیمانوں میں کرتا ہے۔

جس طرح نظری تنقید میں ''بایوگرافیا لٹریریا'' کی ایک اہمیت ہے۔ اسی طرح ماننا پڑے گا کہ کولرج کے ملٹن اور شیکسپیئر پر دیئے گئے لیکچر عملی تنقید کا اہم نمونہ ہیں۔ کلاسیکی نقادوں نے اپنے اصولوں کی کسوٹی پر شیکسپیئر کی جن غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا کولرج نے ثابت کیا کہ یہ غلطیاں دراصل شیکسپیئر کے اوصاف (Strengths) ہیں۔ تنقیدی حوالے سے یہ ایک نیا نقطہ نظر تھا۔ جس نے نئے نقادوں کو شیکسپیئر کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کردیا۔

فرانس نے رومانوی تحریک کو جڑیں فراہم کی تھیں اور فرانس ہی سے اس تحریک کو وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) کی صورت میں وہ نمائندہ میسر آیا، جسے حقیقی معنوں میں رومانی تنقید کا انقلابی نمائندہ کہنا چاہئے۔

ہیوگو 1882ء میں فرانس میں پیدا ہوا۔ وہ فرانس کا ممتاز شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور نقاد ہے۔ پاکستان میں اس کی شہرت اس کے معروف ناول ''نوٹرے ڈیم کا کبڑا'' (The Hunchback of Notre-Dame) کے حوالے سے ایک ناول نگار کی ہے۔ مگر بعض نقادوں کے مطابق وہ فرانس کا سب سے اہم شاعر ہے۔ اس کے ڈرامے ''کروم ویل'' (Cromwell) کا دیباچہ فرانسیسی رومانیت کی سب سے اہم تحریک ہے۔

وکٹر ہیوگو کا کہنا ہے کہ چونکہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اس لیے فن اور تنقید کو نئے معاشرتی اور تاریخی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ وہ انسانی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے ......ابتدائی، قدیم اور جدید۔ ابتدائی دور میں انسان اپنے خدا سے نہایت قریب تھا۔ اس لیے اس کی شاعری حمد، مناجات اور دعاؤں پر مشتمل تھی۔ اور اس کی فارم ''اوڈ'' (Ode) تھی۔ دوسرے دور میں انسان نے معرکے سر کئے فتوحات کیں اور کارنامے سرانجام دیے۔ سو اس دور کا شاعر قومی کارناموں کو ''ایپک'' (Epic) کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ تیسرے دور میں جو جدید دور ہے، انسانی معاشرہ بالکل بدل گیا اور اس کا فن بھی۔ اس کے خیال میں اس دور میں فن کی سب سے اہم فارم ڈراما ہے۔

انقلابی ہیوگو نے کلاسکیت کے سارے اصولوں کو روندتے ہوئے کہا کہ فن کی دنیا میں اصول اور ماڈل نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ نظم کو عروض و قافیے کے جبر سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ اس میں بے ساختگی پیدا ہو سکے...... وہ کہتا ہے، سچا شاعر نپولین کی طرح آزاد ہے۔

وکٹر ہیوگو نے 1885ء میں انتقال کیا۔ ابتدائی ایام میں ایک کیتھولک کی پہچان رکھنے والا ہیوگو بعد میں انقلابی ذہنی تبدیلیوں سے گزرا۔ مرنے سے پہلے اس کی مختصر آخری وصیت بتائی ہے کہ وہ کلیسا کا باغی ہو چکا تھا:

''میں غریب لوگوں کے لیے پچاس ہزار فرانک (Francs) چھوڑ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ انہیں لوگوں میں دفن کیا جاؤں۔

میں نہیں چاہتا کہ چرچ میری تدفین کی رسومات میں شرکت کرے۔

میں تمام نیک روحوں سے دعا کا خواستگار ہوں

میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔''

مدینہ یاد آتا ہے میری نظر میں

صاحبزادہ رشید عثمانی (مرحوم) / خیرپور ٹامے والی

محمد امین ساجد سعیدی کا دل جب رسول ﷺ کے خزانے سے بھرا ہوا ہے۔ وہی ذات اقدس اس کے خیالات کا محور ہے۔ اس کی آنکھیں روضہ رسول ﷺ کے تصور سے چمک رہی ہیں۔ شہر طیبہ اس کی سوچوں میں جلوے بکھیر رہا ہے۔

اسی لیے جب وہ شعر کا ارادہ کرتا ہے تو نعت رسول ﷺ کے دل پذیر الفاظ اس کی زبان پر بے ساختہ رواں ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو روضۂ رسول ﷺ کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

نعت ایک ایسا وسیع موضوع ہے جس کے لیے خیالات اور تصورات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ایک قطرے جتنا نظر آتا ہے اور ایک قطرہ ہزاروں سمندر اپنے اندر سمیٹتا ہوا لگتا ہے۔

داستانِ حسن جب پھیلی تو لامحدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہو کر رہ گئی

جب سرکار دو عالم کا نام لب پر آتا ہے تو ذہن میں ان کی صورت و سیرت کے روشن ابواب جگمگانے لگتے ہیں۔ شاعر کے کلام میں یہ خوبصورت مناظر منعکس ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے فن کا یہی کمال ہے کہ وہ ایک ایک منظر کو قاری کے دل پر نقش کر جاتا ہے۔ واقعہ معراج کے آغاز میں جب جبرائیل آقائے نامدار ﷺ کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے ان کے پاؤں مبارک کا بوسہ دیتے ہیں۔ اس منظر کو شاعر یوں بیان کرتا ہے:

جاؤں قربان جبریل کے بخت پر
آپ کے اس نے چومے قدم یا نبی ﷺ

جب آپ نے آسمانوں کو اپنے سفر سے سرفراز کیا تو اجرام فلکی نے بھی آپ کے قدم چومے۔ شاعر کہتا ہے:

گئے فلک پہ جو آقا مرے شب معراج
ستارے آپ کے قدموں میں آ کے دھول ہوئے

آپ کے رخ پر ضیاء باریوں کے بارے میں شاعر قرآن کے الفاظ بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے:

والشمس والضحیٰ کی تفسیر دیکھئے
اوصاف مصطفیٰ ہیں یہ قرآن کھولیے
پہنچا میں قبر میں تو فرشتوں نے یوں کہا
ساجد امین نعت کا دیوان کھولئے

دیار رسول ﷺ کی یادیں شاعر کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ تصور میں مدینے کے نظارے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ کسی سے ہم کلام ہوتا ہے تو مدینے کا ذکر بھی اُس کی زبان پر آ جاتا ہے۔ محویت کا یہ عالم اسے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہونے دیتا۔ وہ یوں سخن سرا ہوتا ہے:

جلوے درِ سرکار کے رہتے ہیں نظر میں
گفتار سے طیبہ کا حوالہ نہیں جاتا
تصور میں ہیں طیبہ کی بہاریں
کوئی ابرِ کرم چھایا ہوا ہے

کون ہے جسے زندگی کے غم و آلام پریشان نہیں کرتے۔ اگر دل میں مدینے کی محبت جاگزیں ہو اور اسم محمدؐ زبان پر آ جائے تو غم و آلام بھی اپنی شدت کھو دیتے ہیں۔

پڑھتے ہیں جب درود و سلام آپ پر
دور ہوتے ہیں رنج و الم یا نبی
ٹلی مشکل پڑھا صلی علیٰ جب
یہ منظر بارہا دیکھا ہوا ہے

سرکار دو عالم کے بے پایاں الطاف عنایات یاد کرنے سے ہر غم سے نجات مل جاتی ہے۔

ہاں حضور ہو گئے
دکھ ہمارے دور ہو گئے

درود و سلام سے جس کام کا آغاز کیا جائے وہ بخیر انجام پذیر ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

جو درود سے شروع ہوئے
کام وہ ضرور ہو گئے

شاعر نے دورہ کر جو آرزوئیں دل میں بسائی ہیں رب تعالیٰ نے انہیں شرف قبولیت بخشا اور جب وہ زیارت ارض مقدس سے مشرف ہوا تو اس کے دامن میں زندگی کی ساری نعمتیں اور برکتیں آئیں۔ شاعر ان دنوں کو یاد کر کے یوں کہتا ہے:

نبی کی رحمتوں کا ہم خزینہ دیکھ آئے ہیں
دعاؤں التجاؤں کا قرینہ دیکھ آئے ہیں
نہ ٹھہرے سال بھر مہماں رہے بس تیرہ دن ساجد
''مئی'' کے ہم مہینے میں مدینہ دیکھ آئے ہیں

شاعر اپنے فن نعت گوئی کو ایک نعت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

نعت لکھنے کی تجھ کو سعادت ملی
ناز کر اپنی قسمت پہ ساجد امیں

نعت رسول مقبول ایک ایسا خزانہ ہے جس میں روز بروز والہانہ عقیدت کے زر و جواہر شامل ہو رہے ہیں۔ جن کی چمک دمک سے فضا اور بھی پرنور ہو رہی ہے۔ حاصل پور کے خطے میں جہاں عزیز حاصل پوری مرحوم جیسی نعت گو ہستی کا نام بام عروج پر روشن ہے وہاں امین ساجد جیسے ناموس رسالت کے پروانے کی نعتوں کے نذرانے بھی ستاروں کے جھرمٹ کی طرح نظر افروز ہیں۔ کلام کی پختگی خیال کی بلندی محبت کا کامل اور پیرایہ اظہار دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ خدا کرے امین ساجد سعیدی کا نام اپنے شہر، علاقے اور خطے کی پہچان بن کر جگمگائے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کا نذرانہ عقیدت ''مدینہ یاد آتا'' بارگاہ ایزدی اور دربار رسالت میں ضرور باریاب اور مقبول ہوگا۔

عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے......؟

شہزاد بیگ/فیصل آباد

ساری دنیا عطاء الحق قاسمی کے نام سے واقف ہے۔ مگر عجیب اتفاق ہے بقول بیدی پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔ جانے نجانے گل ہی نجانے باغ تو سارا جانے ہے۔ دنیا ادبی اُفق پر عطاء الحق قاسمی کو گزشتہ چھ دہائیوں سے جو مقام واعزاز حاصل ہے انہوں نے جو کار ہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں میرے خیال میں پاکستان کی تاریخ میں کسی اہل قلم کو یہ منصب کم ہی نصیب ہوا ہے۔ بلکہ مجھ سے بہتر آپ اہل قلم بھی جانتے ہیں۔

انہوں نے ہر شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے خود کو منوایا ہے چاہے ان کے طنزیہ کالم ہوں ڈرامے ہوں سفرنامے ہوں شعری مجموعے ہوں یا انتظامی صلاحیتوں کی بات ہو۔ مجھ سے کم علموں کو ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ میرا انہیں خیال کہ ابھی انہیں مزید سفر کی طلب یا تمنا ہو۔ ان کے کریڈٹ پر زندگی کی تمام تر کامیابیاں دھری کی دھری پڑی ہیں۔ ہمیں ان کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے نا کہ گلی کوچوں میں ان کی ذات شعور ڈالنا چاہیے۔ یہ ہمارے مشاہیر کی توہین ہے چلو ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ ان کی کسی پارٹی سے وابستگی ہے تو کیا پاکستان میں کسی پارٹی سے وابستگی رکھنا کوئی جرم ہے یا یہ بھی جمہوریت کا حسن ہے؟

اگرچہ پھر بھی ان کے بارے میں پوچھا جائے کہ یہ عطاء الحق قاسمی کون ہے تو جناب یہ وہی عطاء الحق قاسمی ہیں جن کا کالم ''روزنِ دیوار'' ہے جس کے قارئین دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے دیوانے ہیں۔ دنیا انہیں اتنا کیوں پسند کرتی ہے۔ دنیا ان کی کیوں دیوانی ہے؟ میں جانتا ہوں انہوں نے زمانے کی گرم اور سرد راتوں کو اپنی جوانی کی نذر کیا ہے۔

''نوائے وقت'' کے زمانے میں 320 پر گزارا کیا ہے۔ ان کے ترتیب دیے ہوئے ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحہ کو اہل قلم ایک اہم ادبی دستاویز گردانتے ہیں۔ جب یہ کسی غریب کا نوحہ اپنے کالم میں زینت صفحات کرتے ہیں تو ساری دنیا انہیں اپنی اپنی سی لگتی ہے۔

جب یہ امریکہ چھوڑ کر پاکستان واپس آتے ہیں تو لاہور کی ادبی رونقیں واپس لوٹ آتی ہیں۔ ''لاہور الحمرا'' کی ادبی بیٹھکیں سجاتے ہیں تو چاروں صوبوں کو ایک ٹیبل پر اکٹھا کر دیتے ہیں۔ جب محترم احمد ندیم قاسمی کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو انشاء اللہ سے ماشاء اللہ کا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ گویا دنیا بھر کے اہل قلم اگر انہیں سایہ شجر دار گردانتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

اگر اہل قلم انہیں طنز و مزاح کے حوالے سے عہد حاضر کا اکبر الہ آبادی سمجھتے ہیں تو اس میں بھی ان کا کوئی قصور نہیں ہے اور اگر وہ آج ویل چیئر پر ہیں اور اہل قلم نے اُن کے گھر تانتا باندھا ہوا ہے تو ان کے لیے مقام تشکر ہے کہ احباب انہیں دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ان کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں تاکہ وہ ایک بار پھر یکسوئی کے ساتھ ادبی سفر جاری کر سکیں اور ادبی گفتگو اور ملاقاتوں سے محفلوں کو گرما سکیں۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسوسالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

امکانات کا شاعر......کاشف حسین غائر

شاعر علی شاعر/کراچی

کہتے ہیں ''شاعری'' اپنے آپ کو لکھنے کا عمل ہے۔ ہر شاعر اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، نازک احساسات اور شدید جذبات لکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے مگر اپنی علمی استعداد، ذہنی صلاحیت، قوتِ متخیلہ اور فکر ونظر کی گہرائی و گیرائی کے مطابق کلام کرتا ہے۔ جس کی جتنی صلاحیت ہوتی ہے وہ اُس سے زیادہ ہرگز مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر اس حد تک پہنچ کر شعر کہتا ہے تو وہ شاعری قابلِ ستائش ہوتی ہے اور اگر حد سے گزر کر بات کرتا ہے تو وہ امکانات اور ممکنات کی شاعری کہلاتی ہے جسے ہم بڑی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔

کراچی کے ادبی منظرنامے پر عہدِ حاضر میں سامنے آنے والے شعراء میں ایک قابلِ ذکر نام کاشف حسین غائر کا ہے۔ کاشف حسین غائر نے بھی اپنے ہی آپ کو لکھا ہے مگر اُن کے تلخ وشیریں تجربات کو بیان کرنے کا انداز، اُن کے ہم عصر شعراء سے قطعی جدا ہے۔ وہ اپنے عمیق مشاہدات کو جس ہنرمندی سے شعری پیکر عطا کرتے اور اس میں جس فن کاری سے ندرتِ خیال کا رنگ بھرتے ہیں وہ سب سے منفرد ہوتا ہے۔ کاشف حسین غائر اپنے جذبات کا اظہار بھی جس شعری پیرائے میں کرتے ہیں وہ بڑا متاثر کن ہے۔ اُن کے الفاظ آسان و سہل ہونے کی وجہ سے دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ وہ سہلِ ممتنع میں اپنی بات، اپنے خیالات اور اپنے تصورات کو اِس طرح شعر بناتے ہیں کہ سامع محظوظ اور قاری حظ اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کے اشعار میں فصاحت و بلاغت بھی موجود ہے اور روانی و سلاست بھی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑی عام فہم زبان میں کہہ جاتے ہیں جس سے اُن کی بات کے ابلاغ میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ یہ خوبی ہی شعر کو زبان زدِ عام ہونے کی تحریک و ترغیب دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رات کرتے ہیں ستارے کیسے
رات بھر نیند نہ آنے سے کھلا

....

ہم گوشہ نشینوں سے ہے مانوس کچھ ایسی
جیسے کہ یہ تنہائی ہو اولاد ہماری

....

کیا عجب ہے کہ سربلند کرے
ایک دن مجھ کو انکسار مرا

....

وہ رات جا چکی وہ ستارا بھی جا چکا
آیا نہیں جو دن وہ گزارا بھی جا چکا

....

ذرا سی دیر میں دل میں اُترنے والے لوگ
ذرا سی دیر میں دل سے اُتر بھی جاتے ہیں

کاشف حسین غائر ادبی منظرنامے پر ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئے تو اُن کے کلام کی آب و تاب سے ایک جہانِ شعری جگمگانے لگا جس کی روشنی روز بہ روز فزوں تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس روشن ستارے کے آگے بہت سے کم زور اور خود ساختہ شاعروں کے چراغ ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے، اُن کے کلام کی چکاچوند روشنی سے ایک جہاں تادیر منور رہے گا۔ آیئے کاشف حسین غائر جیسے تازہ کار شاعر کے بارے میں ہم سایہ ملک ہندوستان کے معروف نقاد جناب شمیم حنفی کی رائے ملاحظہ کرتے ہیں:

''کاشف حسین غائر کی شاعری غیر متوقع کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ کاشف حسین غائر کے بہت سے شعروں نے مجھے حیران اور میرے وجدان کو سرشار کیا ہے۔ ہمارے یہاں بالعموم دو طرح کے غزل گو پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے بس دو چار یا دس بیس کمال کے شعر کہے ہیں۔ دوسرے وہ جو بجائے خود کمال کے غزل گو ہیں۔ یعنی کہ ایسے غزل کہنے والے جن کی حسیت اس صنف کی ہیئت اور مزاج اور آہنگ سے ایک فطری مناسبت رکھتی ہے جو بہ ظاہر کسی آورد کے بغیر انوکھا اور یاد رہ جانے والا، مختلف اور غیر متوقع شعر کہہ جاتے ہیں جن کا شعور قوتِ ایجاد سے مالا مال ہوتا ہے:

بستی میں اک چراغ جلنے سے رات بھر
کیا کیا خلل پڑا ہے ستاروں کے کام میں

....

میں نہ پہنچا تو گھر گئے میرے
رات، احباب ڈر گئے میرے

....

میں نے پہنا ہی نہیں غم کا لباس
ہو گیا میلا یہ رکھا رکھا

....

یہ دیکھتی ہی نہیں، بولنے بھی لگتی ہے
اسی لیے تو میں تصویر کم بناتا ہے

....

کاشف حسین خوب ہی ہوتے ہیں اہلِ عشق
اس پار بھی کھڑے ہوں تو اس پار جانئے

کاشف حسین غائرؔ نے کئی مشاعرے میرے ساتھ پڑھے ہیں اور میری اُن سے ملاقاتیں بھی رہی ہیں، ان ملاقاتوں میں بھی اُن کا کلام سننے کا موقع ملا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بااخلاق و باکردار انسان بھی ہیں۔ اپنے ہم عصر شعراء میں سب سے اچھا شعر کہنے اور بے تحاشا داد و تحسین سمیٹنے کے باوجود بھی اُن میں غرور و تکبر یا ریاکاری کی کوئی رمق نہیں ہے۔ وہ انتہائی عجز و انکسار سے ملتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ کاشف حسین غائرؔ مجھ سے جونیئر ہیں مگر مجھ سے بہتر شعر کہہ رہے ہیں۔ اُن کے اشعار میں معانی و مفاہیم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ گویا وہ اپنے شعری اظہار میں ایک مکمل شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ بہت کم شعرا کو یہ عزت اور عظمتِ شاعرانہ نصیب ہوتی ہے۔ اُن کی عظمتِ شاعرانہ کے لیے بس یہ جملے ہی کافی ہیں کہ وہ حروف کی حرمت سے اچھی طرح آشنا ہیں۔ اُنھیں الفاظ کے برتنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور محاورات کے مناسب استعمال کے فن سے بھی بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ شعر کی بُنت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اُنھیں اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں سے آگاہی ہے اور یہی خود آگاہی انسان کو انسان بناتی ہے اور خدا تک رسائی فراہم کرتی ہے۔ کاشف حسین غائرؔ کی شاعری میں بڑی شاعری کے امکانات موجود ہیں لیکن یہ بات ابھی دور اندیشی کے زمرے میں رہے تو بہتر ہے۔

کاشف حسین غائرؔ کے کلام میں شعریت کی چاشنی بھی ہے اور جذبہ و احساس کی بھرپور عکاسی بھی موجود ہے۔ شاعرِ موصوف کے سوچنے کا انداز، چیزوں کو دیکھنے کا اہتمام، خوشی و غم کو برتنے کا سلیقہ، آمد و الہام سے استفادہ کرنے کا انصرام مخصوص ہے۔ وہ اپنی خاص طرزِ ادا سے اپنے محسوسات کو الفاظ کا پیراہن عطا کر کے شعری قالب میں ڈھال دینے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہیں۔ یہی انداز و ادا اور طرزِ اظہار اسی طرح برتا جاتا رہا تو مستقبل قریب میں یہ اُن کا اُسلوب بن جائے گا۔ ابھی بھی اُن کے کلام میں خیال آفرینی، مضمون آفرینی، تازہ کاری اور افکار کی گہرائی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

میں ہی کیا گھر پہ پڑا رہتا ہوں
گھر سے جاتی نہیں ویرانی بھی

....

ہوئے ہیں قتل ہم اپنے ہی ہاتھوں
کرے گا کیا کوئی ماتم ہمارا

....

زمیں کے جسم پر قبریں نہیں ہیں
خیالِ رفتگاں رکھا ہوا ہے

کاشف حسین غائرؔ کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جو اپنے ہونے کا اعلان اپنے آغاز ہی سے کر دیتے ہیں۔ کاشف حسین غائرؔ کے دو شعری مجموعے ''راستے گھر نہیں جانے دیتے'' اور ''کہاں جائے گی تنہائی ہماری'' کے مطالعے کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ کاشف حسین غائرؔ اُردو کے جدید شعری ادب کے اُفق پر نمودار ہونے والا وہ روشن ستارہ ہے جس کی آب و تاب ویسے ویسے فزوں تر ہو رہی ہے جیسے جیسے رات کی تاریکی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایسے روشن ستارے کی چمک تاریک راتوں میں ماہِ منور کی کمی کو پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ایک اور اہم بات لکھ رہا ہوں جسے بہ آسانی ثابت بھی کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ جس طرح احمد فرازؔ اپنے اشعار میں خیالات کو سجا کر پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح کاشف حسین غائرؔ بھی اپنے اشعار کو نادر خیالات سے سجا کر پیش کرنے کے ہنر سے بہ خوبی واقف ہیں بلکہ الفاظ کی تہ داری سے بھی مکمل طور پر آشنا و آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فرازؔ کے بعد کاشف حسین غائرؔ کے کلام میں وہ تمام حسن شعری کے لوازمات نظر آرہے ہیں جو شاعر کو زندہ بھی رکھتے ہیں اور اُس کے کلام کو ہر دل عزیزی بھی عطا کرتے ہیں۔ کاشف حسین غائرؔ کے اشعار جہاں سہلِ ممتنع کی عمدہ مثال ہیں، وہاں مدعائے دل کا بہترین ابلاغ بھی۔ آخر میں چند ایسے اشعار پیش ہیں جن میں تاثیر کے ساتھ ساتھ خیال کو بھی سجا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ اشعار زبان زدِ عام ہونے اور دل میں اُترنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں:

شام ہوتے ہی کہاں جاتا ہوں، کیا بتاؤں
آدمی ہو کے پریشان کہاں جاتا ہے

قلندر کی صدا......دُکھی انسانیت کی پکار

جاوید قاسم/لاہور

ہم ایک ایسی ریاست کے باشندے ہیں جہاں خاص کر ادب جیسی لطیف صنفِ سخن کو نہ صرف ٹیڑھی نظر سے دیکھنے کا رواج عام ہے بلکہ اسے کارِ فضول سمجھ کر ہمیشہ سے طنز وتنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور یہ افسوس ناک رویہ آج بھی ہمارے فرد فرد معاشرے میں اپنی جڑیں کچھ اتنی مضبوط کیے ہوئے ہے کہ تہذیب وتمدن کے ہرے بھرے پیڑوں سے حکمت وآگہی کے پرندوں کی مدھر چہکاروں کی جگہ ہر شاخ پر اُلّو بول رہے ہیں، جن کی بے سُری آواز نے سازِ فطرت کے تار تار کو دولخت کر دیا ہے۔

نوید مرزا سے میری رفاقت یقیناً ۲۰/ ۲۵ سالوں پر محیط ہے۔ جب میں ۹۰ کی دہائی میں اپنے آبائی شہر میاں چنوں سے ہجرت کر کے لاہور میں پناہ گزیں ہوا تو میرے ٹھٹھرتے ہوئے دنوں اور سلگتی ہوئی راتوں کو ترتیب وقت اُلٹ پلٹ کے سب سے پہلی پناہ شاعر درویش محترم بشیر رحمانی نے دی جن کے آستانہ رحمانی کا فیض آج بھی میرے شب و روز کو ماں کی دعاؤں کی طرح اپنی پناہوں میں لیے ہوئے ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، جو بھی ذی روح اس دنیا میں آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ ضرور چکھنا پڑتا ہے۔ یہ امر اپنی جگہ پر سو فیصد حقیقت سہی مگر کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو مر کر بھی موت کی گرفت میں نہیں آتے۔ وہ اپنی مختصر سی زندگی میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دے جاتے ہیں جنہیں نہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ چھو کر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا میں آج بھی محترم بشیر رحمانی کو اسی طرح اپنے اردگرد کے ماحول میں دیکھتا ہوں جیسے اُن کی حیات میں انہیں جاگی ہوئی کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ محترم بشیر رحمانی کی زندگی کے تمام پہلو درویشانہ اور قلندرانہ تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ایسی درس گاہ تھے جہاں دوستوں کو خلوص، دشمنوں کو محبت اور اولاد کو اخلاص کا درس ملتا تھا اور یہ اُس درس گاہ کی تربیت کا اثر تھا کہ نوید مرزا کو ''ٹھنڈا سورج'' کے ٹھٹھرتے ہوئے شب و روز کے ابتدائی مراحل ہی میں اس بات کا پورا ادراک ہوگیا تھا کہ اب فضاؤں سے مے نہیں لہو برستا ہے۔ اب رحمت کی صراحیاں خشک ہو چکی ہیں۔ قطرہ قطرہ ساغر و مینا پیاس اُگل رہے ہیں۔ ہواؤں کے نرم و نازک مزاج طبیعتوں میں شعلے اُنڈیل رہے ہیں۔ موسموں کے زرق برق لباس تار تار گریبانوں کی طرح بزمِ عالم میں تماشا بن چکے ہیں اور راحت بخش سائے دھوپ کی دہلیز پر اس شدت سے ماتھے رگڑ رہے ہیں کہ ان کی جبینوں کے پاکیزہ نقش کسی گناہ گار دل کے سیاہ دھبوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور یہی وہ احساس تھا جس کی بدولت نوید مرزا برف لمحوں کا صحرائے بیکراں، تیشہ عزم و ہمت سے کاٹ کر گنجان آباد بستیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب و کامران ہوا جہاں اس کی لذتوں سے ترسی ہوئی آنکھیں چہروں سے تو بھر گئیں مگر دل کی خلش تھی کہ اور ہی بڑھتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ چہروں کی اس بھیڑ میں کہیں گم ہو جاتا کہ اچانک ؏ فریدہ ٹریا ٹریا جا...... کی سرگوشی اس کی سماعت سے کچھ اس طرح ٹکرائی کہ اس کا عزم اور ولولہ پھر سے تازہ دم ہوگیا اور وہ بے قراریٔ دل کا ہاتھ تھام کر چہروں کے انبوہ سے راستہ بناتا ہوا اُس مقامِ محبت تک پہنچ گیا جہاں سرخمیدہ، دستہ بستہ محبت اس کے روبرو کھڑی اُسے سلامیاں دے رہی تھی۔ مگر عجیب بات تو یہ ہے کہ فرصت کے دن رات سے رہائی کے باوجود نہ ہی اس کے دل کی دھڑکن تھمی اور نہ ہی اندر کے کرب میں کچھ کمی واقع ہوئی اور وہ روبرو کھڑی محبت پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کے سینہ ودل کے درمیان پھیلے ہوئے وارث شاہ کے جنگل بیلے میں اپنی نظروں کی جائے نماز پر سماعت کے سجدے کچھ اس خشوع وخضوع سے ادا کرنے لگا کہ رفتہ رفتہ ونجلی کی میٹھی سُریں گھنگھروؤں کی چھنن چھنن میں تبدیل ہوتی گئیں اور رقصِ محبوب بلھے شاہ کی دھمال میں ڈھل کر باہو کی ہُو کے روپ میں شاہ حسین کے مادھو لال کو مجاز کے تنگ وتاریک راستوں پر حقیقت کی روشنی عطا کرنے لگا۔ گمان پر یقین غالب آتا گیا۔ اندر کے سارے داغ دھبے صاف ہوتے گئے۔ رگ و پے کا سارا میل دھلتا گیا اور خون کے بہاؤ میں روانی آتی گئی اور جب دھڑکنوں کا اعتدال بحال ہوا تو ''قلندر کی صدا'' دُکھی انسانیت کی پکار بن کر اس کی سماعت کے دریچوں سے ٹکرانے لگی اور یہ سارا فیض اُسی آستانہ رحمانی کا ہے جس کا اعتراف نوید مرزا نے اس انداز میں کیا:

اُس کے اندر فقیر ہوتا ہے
باپ بھی ایک پیر ہوتا ہے

''قلندر کی صدا'' سے میری پسند کے چند ایک اور شعر دیکھیں:

قفس کے سکتے میں آ گئے ہیں
مہیب سائے غلام روحیں

......

جو خواہش اولیں تھی آخری کی
کہاں شاخِ تمنا بھی ہری کی

......

یزید وقت کہاں مجھ کو روک سکتا ہے
حسینیت کا میں پرچار کرنے والا ہوں

لبنیٰ صفدر کی شاعری......میٹھی اور سریلی آواز

ریاض ندیم نیازی/سبی

کچھ دن پہلے میں نے پاکستان کے ایک کم مردم خیز علاقے سرگودھا سے تعلق رکھنے والی ایک پڑھی لکھی شاعرہ لبنیٰ صفدر کی میٹھی اور سریلی آواز کو ان کے شعری مجموعے ''خوش بو ہے وہ صندل کی'' میں اپنے طور پر مطالعہ کیا۔اس سے قبل بھی اُن کے تین مجموعے شائع ہوکر عوام سے دادوتحسین وصول کر چکے ہیں۔اب وہ ایک نئے مجموعے کی تیاری میں مصروف ہیں۔

پنجاب کے ایک زرخیز علاقے میں رہنے والی یہ شاعرہ لبنیٰ صفدر پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت لب ولہجے کی شاعرہ ہیں۔وہ جب شعر کہتی ہیں تو خوب جم کر کہتی ہیں۔

لبنیٰ صفدر نے شاعری کے سارے ہی ڈھنگ،لب ولہجہ اور الفاظ کے برتنے کا سلیقہ اور طریقہ اپنے اُس چھوٹے سے وسنیک ہی میں سیکھا ہے اور وہ اسی سہارے شاعری کا سفر طے کیے جا رہی ہیں۔

اس شاعرہ لبنیٰ صفدر نے اپنی عمر کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ہی ساتھ شاعری کے نئے اور اعلیٰ اوصاف کو برقرار رکھنے میں بھی عمر صرف کی ہے۔مثلاً اس کا یہ سلیقہ تو بہت ہی اعلیٰ ہے۔دیکھیے تو:

اُس سے رشتہ بحال رکھا ہے
گرچہ غم نے نڈھال رکھا ہے

....

آخر ہونا تو ہے جدا لبنیٰ
بس ذرا کل پہ ٹال رکھا ہے

....

ایک اور انداز میں وہ یوں کہتی ہیں:

تمہارے ہجر کے لمحے تھے یا قیامت تھی
جو گیت وصل کا تھا وہ دُہائی دینے لگا

اس کے شعر کہنے کا یہ دکھ جمال میں کیسے در آیا۔اس دکھ سے پتا چلتا ہے کہ آئینہ دیکھ کر میں حیرت میں ہوں:

آئینہ دیکھ کر ہوں حیرت میں
دکھ میں اتنا جمال کیوں آیا

لبنیٰ صفدر کی شاعری کے کئی اسلوب ہیں وہ اپنے ایک کمال کا اور سچا جذبہ ہتھیلیوں پر لیے پھرتی ہیں۔ذرا سوچئے آپ اس جذبے کو کس طرح محو کر سکتے ہیں۔معلوم نہیں!دیکھئے تو اس کا احساس کیجیے:

ہجر کی تمازت میں روح جلنے لگتی ہے
سانس لڑکھڑاتی ہے بارشوں کے موسم میں

لبنیٰ صفدر کے یہاں نہ جذبات کی کمی ہے اور نہ ان کے برتنے کا سلیقہ ہی کم ہے۔ذرا یہ بھی دیکھ لیجیے:

جان جب تک فنا نہیں ہوتی
رسم اُلفت ادا نہیں ہوتی

....

آپ کو دیکھ کر ہُوا احساس
عشق کی انتہا نہیں ہوتی

لبنیٰ صفدر کے یہاں ایک جذبہ ہے کہ غبار ہو رہا ہے۔مگر وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہو رہی ہے۔وہ اس موقع پر بھی خوش ہے۔آپ بھی دھیان دیجیے،کیا انداز ہے:

ہوائے ہجر میں خود کو غبار کرتے ہوئے
بکھر رہی ہوں ترا انتظار کرتے ہوئے

....

تمہارا نام ستاروں پہ لکھتی رہتی تھی
یہ عمر کاٹ دی تارے شمار کرتے ہوئے

ایک موقع پر تو اُس نے حد کر دی ہے اور کیا سلیقے سے اُس نے کہہ دیا ہے۔آپ بھی ذرا غور کریں اور دیکھیں،واقعی مزہ آئے گا:

زبان کانپ گئی تھی بیان دیتے ہوئے
جو میرا حصہ وراثت سے بھائی دینے لگا

کبھی کبھی تو لبنیٰ کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ خود اپنے آپ میں نہیں ہے اور وہ کسی اور زمانے کی بات کر رہی ہے۔اسے اس بات کا بھی کوئی غم نہیں ہے اُسے اپنے مافیہا کی بھی خبر نہیں۔

بس وہ تو اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہے:

کبھی تو لبنیٰ یہ چاہوں کہ کھلکھلا کے ہنسوں
خود اپنے آپ کو یوں سوگوار کرتے ہوئے

افضال نوید/کینیڈا

معنی سے اور معنی نکلتے رہے جو ہم
لکھنے کے ساتھ ساتھ مٹانے میں لگ گئے

سیکھے بغیر ہم جو سکھانے میں لگ گئے
جلتے ہوئے چراغ بجھانے میں لگ گئے
عنقا سے آنکھ ملتے ہی میں بھی نہیں رہا
کیا کیا طیور شور مچانے میں لگ گئے
میں دیکھتا ہی رہ گیا افلاک کی طرف
آئینے میرے آئینہ خانے میں لگ گئے
آواز کوئی پڑتی رہی دور سے کہیں
کتنے مکان چھوڑ کے جانے میں لگ گئے
بھڑکا خلا چراغ سا پروانہ گیری سے
انجم خمیرِ ذات اُٹھانے میں لگ گئے
پیوستِ وقت کر دیا ہر لختِ وجد کو
مجھ پر جو جسم و جان زمانے میں لگ گئے
موسم تری ہتھیلی پہ ٹھہرے تو عمر بھر
شاخِ حنا پہ پھول کھلانے میں لگ گئے
گھومی ہوئی زمین ملی ہم کو اور ہم
آئے اور اس کو اور گھمانے میں لگ گئے
جس میں میں سانس لے سکوں بس اپنا ایک سانس
افلاک میرا لمحہ بنانے میں لگ گئے
اپنے لہو کی بوند بھی ہم پر نہ کھل سکی
ہم دوسروں کا خون بہانے میں لگ گئے
آئے تو تھے سمجھنے تگ و تازِ زندگی
ہنگامہ دیکھ پینے پلانے میں لگ گئے
تاخیر سے وہ آئے تو آنے کے ساتھ ہی
تاخیر کا جواز بتانے میں لگ گئے
معنی سے اور معنی نکلتے رہے جو ہم
لکھنے کے ساتھ ساتھ مٹانے میں لگ گئے
اور ساتھ ہی جرائم نو نے جنم لیا
اور ساتھ ہی حساب چکانے میں الگ گئے
اُس کی گلی پہ کاہکشاں آ کے جھک گئی
ہم بھی نوید سر کو جھکانے میں لگ گئے

لعلیں لبِ زرفام سے لبریز سخن تک
پھیلا رہا یک حسن جہاں تاب چمن تک
تھا خارِ دل اندوز بچھڑنے کی چبھن تک
تیور سے اُٹھا رنج تھا ماتھے کی شکن تک
دل سے نہ زباں کی بنی پھر بات دہن تک
آیا نہ پلٹ کر مرا بے ساختہ پن تک
تن سے ابھی نکلا نہ تھا اور پچھلے چمن تک
لے آیا کوئی خواب ترے سرو و سمن تک
بوئے دمِ ناپید تھے ہم لالہ و گل سے
آنگن سے کنارہ کشیٔ کوہ و دمن تک
گویا در و دیوار سے نکلے در و دیوار
دہلیز پہ تھی دربدری اگلے ملن تک
کھلتے ہی مرے آنکھ پہ تو کھل گیا کیا کیا
کچھ سمتوں کا معلوم نہ تھا تجھ سے لگن تک
دعوت سے دلِ سرخ مچا کر رہا کہرام
اک سیب کا رس کھینچ کے رہا سیب ذقن تک
پھر صبح تھی اک شب کے طلسمات سے روشن
کرنوں میں نہایا رہا میں پہلی کرن تک
پیوستِ مہ و مہر تھے عشاق کہ ہر سُو
بدلی صفِ گلریز میں شعلوں کی جلن تک
تو جھینپ سے روشن تھا کہ جچتا تجھے آیا
چہرہ ہوا گلنار ستاروں کی پھبن تک
انداز سے چلتا ہوں ہوا لے ہی نہ جائے
آنچل میں وہ لے لپکا نہیں چھیڑا بدن تک
کیا کیا تھی نزاکت کہ خوشی بھی گراں تھی
گفتار سے بل کھاتا رہا اُس کا دہن تک
رفتارِ زمیں تجھ سے بندھی تھی مری جس جا
تو جا چکا اور بھول گیا میں بھی چلن تھا
گزریں نظراندازی سے ایام نوید اب
دستک دیے بن جاتی ہے سینے پہ دکھن تک

کیا بات ہے ٹکرانے سے سر کھلتا نہیں ہے
آواز میں دیتا ہوں تو در کھلتا نہیں ہے
دستک سے جہاں کھلتا تھا در کھلتا نہیں ہے
یہ کس کے نہ ہونے کا ہے ڈر کھلتا نہیں ہے
ہے کون جو میرا ہے مگر میرا نہیں ہے
مجھ پر مرے جنموں کا سفر کھلتا نہیں ہے
کب سے ہوں ترا راہ نشیں کھل گیا لیکن
کب تک ہوں ترا خاک بسر کھلتا نہیں ہے
موجیں لیے جاتی ہیں کہاں علم ہے کس کو
طوفان ہے کیوں زیر و زبر کھلتا نہیں ہے
ہم نے تو نوید اپنی روش سے نہیں ہٹنا
ہم کو نہیں پرواہ اگر کھلتا نہیں ہے

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

پرندے جس جگہ پر بندشِ پرواز کرتے ہیں
چلو ہم پھر وہاں سے داستاں آغاز کرتے ہیں

چہرہ خوب سجا رکھا ہے
دل میں درد چھپا رکھا ہے

زندہ رہنے کی اک صورت
غم شعلہ سُلگا رکھا ہے

سچے جھوٹے علم و ادب میں
تیرے بن اب کیا رکھا ہے

اگلا موڑ جدائی کا ہے
دل کو یہ سمجھا رکھا ہے

دوری کا رومان ہے عزمی
ورنہ چاند میں کیا رکھا ہے

شعر میں لفظ نہیں رنگِ سخن بولتا ہے
دیکھ لینا مرے شعروں کی لطافت اب کے

کسی موہوم سی امید پہ کیا حاصل ہے؟
شوق کی حد سے نکل کر، کرو ہمت اب کے

رہن کیوں رکھ دی ہیں تم نے مری آنکھیں اے دوست!
مجھ کو تو چاہیے تھی حدِ بصارت اب کے

میرے ہمسائے کی یہ آہ و فغاں کہتی ہے
ٹوٹنے والی ہے ہم پر بھی قیامت اب کے

وہ جو آئے گا تو عزمی کا ہے بستر، حاضر
تنگیٔ جا کی بھلا کیسی شکایت اب کے؟

بیاضِ دل پہ لکھے چہرے میرے سامنے ہیں
مرے اپنے محبت پارے میرے سامنے ہیں

کھلے ہیں پھول سے چہرے سرِشاخِ تمنا
بہاروں کی ہوا کے جھونکے میرے سامنے ہیں

حریمِ فن میں جو تکریم کے قابل ٹھہرتے ہیں
وہی اس عہد کے شہ پارے میرے سامنے ہیں

تم آئے ہو تو جاناں، کیسا پردہ اور تکلف کیا؟
تمہارے خط سبھی خفیہ اشارے، میرے سامنے ہیں

میں اُس کے ریشمی وعدوں کی چادر تان لوں عزمی
کڑی منزل ہے سورج کے شرارے میرے سامنے ہیں

پرندے جس جگہ پر بندشِ پرواز کرتے ہیں
چلو ہم پھر وہاں سے داستاں آغاز کرتے ہیں

ہمارے دور میں سچائی بھی نامعتبر ٹھہری
اسی مبرم حقیقت کو ہمیں غماز کرتے ہیں

سمندر پار سے آتے ہوئے جھونکے یہ کہتے ہیں
بہارِ تازہ کا ہم بھی درِ گل باز کرتے ہیں

کبھی چڑیوں سے تو اونچی اڑانیں ہو نہیں سکتیں
فلک بوسی جو کرتے ہیں، فقط شہباز کرتے ہیں

ہیں مستقبل کی تابندہ امانت آج کے سپنے
اسی دولت میں ہم تم کو شریکِ راز کرتے ہیں

تم تو کہتے تھے نہیں ہوگی محبت اب کے
دل پہ ٹوٹی ہے مگر پھر وہی آفت اب کے

پہلے پہلے تو خسارا تھا بہت کم اس میں
تاج اور تخت کی مہنگی ہے تجارت اب کے

وہ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کے جب وار کرتا ہے
تو گویا صاف اپنی ہار کا اقرار کرتا ہے

مجھے اپنے عدو سے عمر بھر ہشیار رہنا ہے
کمینہ شخص ہے وہ چھپ کے اکثر وار کرتا ہے

مجھے سونے نہیں دیتا کسی موسم کے بستر پر
کوئی سا وقت ہو، جانے وہ کیوں بیزار کرتا ہے

کسی انگڑائی کے پیچاک میں الجھائے رکھتا ہے
وہ اکثر دیدۂ نمناک میں اظہار کرتا ہے

ہمارے بعد کی نسلیں نجانے کیا کہیں اس کو
ہمارے عہد کا انساں جو کاروبار کرتا ہے

میں اک مدت سے کوشاں ہوں، سمجھ پایا نہیں اس کو
کبھی اقرار کرتا ہے، کبھی انکار کرتا ہے

اسے معلوم ہے عزمی کہ عزت کیسے بنتی ہے
مگر وہ جان کر مجھ کو ذلیل و خوار کرتا ہے

نہ سوچا ہم نے تھا اس جان اور پہچان سے پہلے
لگا بیٹھے یہ دل کیوں اُس بتِ نادان سے پہلے

ہمارے پاس تو اخلاص کی پونجی ہے اور کیا ہے
خدارا لاج رکھ لینا کسی اعلان سے پہلے

نہیں ممکن، تمہارے بعد ہم پھر اور کو چاہیں
صحیفے ہو گئے متروک سب، قرآن سے پہلے

مبارک ہو مرے سالار کو اک تازہ پسپائی
جھکایا پھر علم اُس نے، نئے گھمسان سے پہلے

کہانی لکھنے والے نے غلط لکھا ہے جو لکھا
بہت کچھ اور بھی لُوٹا گیا سامان سے پہلے

مرے مولا بھرم رکھنا، سرِبزمِ سخن میرا
غزل عزمی کی یہ پہچان ہو، دیوان سے پہلے

ڈاکٹر فیصل کمال حیدری/لاہور

"یہ تعلق آخری سانسوں میں ہے" میں نے کہا
اور پھر اُٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا "کیا پتہ"

ہے تیرے کن کا کرشمہ، سنبھال شوق سے تو
ہے ملک تیری ہی جنت، نکال شوق سے تو
جب اختیار تجھے ہے تو ہے قبول مجھے
اس اختیار کو مجھ پر اچھال شوق سے تو
جواب جیسا بھی میرا ہو، تجھ پہ ہے لازم
مری پرکھ کے لیے کر سوال شوق سے تو
مرے لیے تو غنیمت ہے چار دن کا ثبات
تری رضا ہے تو رہ لازوال شوق سے تو
میں لمحہ، لمحہ، مروں ہے یہی مری قسمت
اُدھر تڑپتا رہے، سال سال شوق سے تو
مری غزل نے کیا، تجھ کو شاہِ حسنِ جہاں
ثنا کو ترسے گا، کر پائمال شوق سے تو
خرد کا سحر ذرا ٹوٹ لے تو پھر دیکھوں
مری پناہ میں ہوگا کمال شوق سے تو

راہِ وفا کٹھن نہ تھی اتنی مگر کمال
مخلص ہی مجھ سے تھا نہ مرا ہم سفر کمال
دشتِ طلب کو پار کیا تو پتہ چلا
اک سائے کے لیے ہی پھرا عمر بھر کمال
خاموش موسموں میں یہ بادِ صبا کا شور
یہ میرا وہم ہے یا نوید سحر کمال
تنہا کھڑا ہوں محفل یاراں میں اس طرح
گلشن میں جیسے کوئی شجر بے ثمر کمال
اس بار کی خزاں نے تماشے ہیں کیا کیے
ہونے لگا ہے زرد کہ خونِ جگر کمال
گھر کو چلو کہ شام ہوئی اب تو شب زدہ
ہے منتظر وہاں پہ ترا قفل در کمال
افسردگی ہی طاری تھی یارانِ شہر پر
ورنہ تو سب نے دیکھا تھا روشن قمر کمال

کہیں ہیں لوگ مجھ سے بے وفا سا ہو گیا ہوں
زیادہ تو نہیں، پر ہاں، ذرا سا ہو گیا ہوں
تری تعریف کرنے کو نہیں اب چاہتا دل
میں اپنی ذات سے جب سے شناسا ہو گیا ہوں
بنا لب کھولے ہر اک آرزو پوری ہوئی ہے
خدا یا رو نہیں لیکن خدا سا ہو گیا ہوں
میں تجھ سے تشنگی اپنی مٹانے کو ملا تھا
ہوا یہ کیا کہ میں کچھ اور پیاسا ہو گیا ہوں
اجی چھوڑو! کہاں کی بے وفائی، کیا برائی
کوئی اچھا ملا تو میں برا سا ہو گیا ہوں
مجھے یوں غور سے کیوں دیکھتے ہو، کیا ہوا ہے؟
میں کیا اک نقش کچھ دل سے مٹا سا ہو گیا ہوں؟
بھرم اپنا ہی توڑوں، پھاند جاؤں گر یہ ریکھا
میں اپنے گرد ہی اک دائرہ سا ہو گیا ہوں
مجھے ہر وقت سارے غمزدہ کیوں ڈھونڈتے ہیں؟
میں لوگوں کے لیے شاید دلاسہ ہو گیا ہوں
کمال اب تو مرے ہر زخم سے خوں بہہ رہا ہے
وہ کہتا ہے گل لالہ کھلا سا ہو گیا ہوں

پڑاؤ ہجر و وصال کا تھا، کمال کا تھا
کہ آخری وقت سال کا تھا، کمال کا تھا
غروب خاور سے کچھ ہی پہلے جدا ہوئے ہم
یہ وقت گرچہ زوال کا تھا، کمال کا تھا
نہ لطف عہدِ وفا، نہ ترکِ وفا میں پایا
ہاں! مرحلہ جو ملال کا تھا، کمال کا تھا
تمام شامیں برنگ فصلِ بہار نکھریں
ثمر یہ بس اک خیال کا تھا، کمال کا تھا
یہ ماہِ شب کیا ترے بھی جذبے جگا رہا ہے؟
گو مسئلہ اک سوال کا تھا، کمال کا تھا
سکوت طاری تھا اہلِ دل پر، خرد پریشاں
کرشمہ جس کی بھی چال کا تھا، کمال کا تھا
یہ فخر تیرا ہے یا کہ میرا، کہ سب کہیں ہیں
کہ دوست فیصل کمال کا تھا، کمال کا تھا

میں تھا اُس کے واسطے یا وہ مرا تھا، کیا پتہ
کون کس کی زندگی میں حادثہ تھا، کیا پتہ
جانے کس لمحے کہانی کی ہوئی تھی ابتدا
کون سا لمحہ پھر اس کا خاتمہ تھا، کیا پتہ
زیست استفسار ہو کر رہ گئی، میں کیا کہوں
کب سے تھا؟ کیسا تھا؟ کیوں تھا؟ کون کیا تھا؟ کیا پتہ
درحقیقت وہ مسافت میں مرے ہمراہ تھا
یہ بھرم تھا، حوصلہ یا شائبہ تھا، کیا پتہ
"یہ تعلق آخری سانسوں میں ہے" میں نے کہا
اور پھر اُٹھتے ہوئے اُس نے کہا تھا "کیا پتہ"
دوسروں کی بات کیا، میں ہوں تذبذب میں کہ میں
تھا حقیقت یا کسی کا واہمہ تھا، کیا پتہ
میں تھا کٹھ پتلی کسی کی اُنگلیوں پر محو رقص
یا کمالؔ افضل تریں خلق خدا تھا، کیا پتہ

نبیل نجمؔ/لاہور

اب شہر چھوڑ جانے کی مہلت نہیں نصیب
سنتا نہیں تھا بات کوئی میری دھیان سے

دیکھ دریا سے ہٹ گیا ہوں میں
تھا کنارا سو کٹ گیا ہوں میں
ایک موسم کی طرح آیا تھا
رفتہ رفتہ پلٹ گیا ہوں میں
جہاں ملتے تھے، آج مدت بعد
اُس شجر سے لپٹ گیا ہوں میں
پیار کا لمحہ کب میسر تھا
جب ملا تو جھپٹ گیا ہوں میں
یاد ہوتا نہ تھا نجمؔ وہ شخص
اس لیے اُس کو رٹ گیا' ہوں میں

چھت پہ آ کر کھڑی ہوئی ہے وہ
اُس کے پہلو میں ڈھل رہا ہے چاند
کیسا چالاک ہو گیا ہے اب
کتنی شکلیں بدل رہا ہے چاند
جھیل کے ساتھ چل رہی ہے وہ
ساتھ ساتھ اُس کے چل رہا ہے چاند
دیکھتا ہوں میں اُس کے گالوں کو
جیسے اُن سے نکل رہا ہے چاند
چاند تھا وہ زمیں کا کوئی نجمؔ
جو کہ میری غزل رہا ہے چاند

تارے اُتر رہے ہیں جہاں آسمان سے
منظر وہ دو قدم پہ ہے تیرے مکان سے
کوئی تو بات غیبی ہے جو کہ خبر میں ہے
کچھ تو بتا رہے ہیں پرندے اُڑان سے
اب شہر چھوڑ جانے کی مہلت نہیں نصیب
سنتا نہیں تھا بات کوئی میری دھیان سے
ٹھوکر سے اپنی وہ جو ہٹا سکتے تھے اُسے
اب وہ بھی مانگنے لگے رستہ چٹان سے
دشمن کے ساتھ صلح بھی ہو سکتی ہے نبیلؔ
کھینچا نہیں ہے تیر ابھی تو کمان سے

ابھی کچھ چاند باقی ہیں اندھیرا ہو نہیں سکتا
اندھیرا ہو بھی جائے تو گھنیرا ہو نہیں سکتا
بگڑتے جا رہے ہیں اس طرح حالات لگتا ہے
تو میری ہو نہیں سکتی میں تیرا ہو نہیں سکتا
چلی ہیں آندھیاں ایسی کہ تھمتی ہی نہیں ہیں اب
پرندوں کا شجر میں بھی بسیرا ہو نہیں سکتا
جہاں پر ظلم ہوتا ہو غریبوں پر یتیموں پر
مرے اجداد کا ایسا تو ڈیرہ ہو نہیں سکتا
نجمؔ یہ دل تو کہتا ہے کہ سورج سچ کا نکلے گا
مگر یہ لوگ کہتے ہیں سویرا ہو نہیں سکتا

پربتوں سے پھسل رہا ہے چاند
رفتہ رفتہ سنبھل رہا ہے چاند

دور سے جو سلام ہے کیا ہے
پیار ہے انتقام ہے کیا ہے؟
زیست میں موت، موت میں ہے زیست
صبح ہے یا کہ شام ہے کیا ہے؟
غم کے اندر خوشی، خوشی میں غم
سب کا جینا حرام ہے کیا ہے؟
ایک لمحہ نہیں ہے اپنے لیے
عشق کرنا بھی کام ہے کیا ہے؟
مر کے ہم جائیں گے اُسی کے پاس
وہی جس کو دوام ہے، کیا ہے؟
آنکھ ہے یا پیالہ ہے یہ نجمؔ
اشک ہے یا کہ جام ہے کیا ہے

اظہار نہ ہو پایا
یوں پیار نہ ہو پایا
میں تیری محبت میں
کیوں خوار نہ ہو پایا
رستہ تھا، رہا رستہ
دیوار نہ ہو پایا
فرصت نہ ملی غم سے
بیکار نہ ہو پایا
تھا خواب ترا پیہم
بیدار نہ ہو پایا
ہونے کا تجسّم اپنے
اقرار نہ ہو پایا

اعظم سہیل ہارون/حاصل پور

ہر نیا امتحان لگتا ہے — آخری امتحان ہو جیسے

بارش میں بھیگنے کی وہ عادت نہیں رہی
پہلی سی اب ہمیں بھی محبت نہیں رہی
غم ہائے روزگار نے یہ بھی ستم کیا
اِک دوسرے سے ملنے کی فُرصت نہیں رہی
رہتا تھا بن کے سایہ کبھی ساتھ جو مرے
وہ کہہ گیا کہ تیری ضرورت نہیں رہی
کِس سمت جا رہا ہے زمانہ یہ دوستو !
اب تو بڑوں کی بھی کوئی عزت نہیں رہی
اعظم غموں نے کر دیا کمزور اِس قدر
اب اور دُکھ اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی

اُسے ترتیب دینا ہے' اِسے ترتیب دینا ہے
بتایا کچھ نہیں اُس نے' کِسے ترتیب دینا ہے
محبت کی کہانی کے سبھی کردار اُس کے ہیں
ہےاُس کے پاس وہ سب کچھ جسے ترتیب دینا ہے
بنا کر کاغذی کشتی چلاتے تھے جو پانی پر
وہ بچپن یاد آتا ہے اُسے ترتیب دینا ہے
مٹا ڈالا ہے تیرا نقش جو اک تھا مرے دِل پر
مجھے اب وہ نئے انداز سے ترتیب دینا ہے
ضروری تو نہیں اب یہ مجھے تم بھول ہی جاؤ
مجھے ٹوٹا ہوا دِل کس لئے ترتیب دینا ہے
جو پیکر آس کا بکھرا پڑا ہے ٹوٹ کر یارو
اُسی پیکر کو اپنے ہاتھ سے ترتیب دینا ہے
مرے جذبوں کا دم گھٹنے لگا ہے دیکھ لو آ کر
کہ چاہت لفظ جو اک تھا مجھے ترتیب دینا ہے
ہمارا حال دنیا کو بتاتا جا رہا ہے وہ
ہمیں اب اُس کو دنیا سے پرے ترتیب دینا ہے

ردائے سبز اوڑھی ہے چمن نے اس لئے اعظم
مجھے اک گوشہ تیرے نام سے ترتیب دینا ہے

زندگی امتحان ہو جیسے
آگہی امتحان ہو جیسے
دکھ ملے اِس قدر' مگر اب تو
ہر خُوشی امتحان ہو جیسے
اِس کڑے دور کی نئی دنیا
آدمی امتحان ہو جیسے
ہر نیا امتحان لگتا ہے
آخری امتحان ہو جیسے
دوست ہی دوست کا بنا دُشمن
دوستی امتحان ہو جیسے
رات غم کی ہے اِس طرح اعظم
روشنی امتحان ہو جیسے

ہمارا تھا کبھی جو پل تمہارا ہو بھی سکتا ہے
ترے آنگن میں جگنو سا ستارا ہو بھی سکتا ہے
کیسے آباد کرنا ہے؟ کیسے برباد کرنا ہے؟
یہ ظالم عشق ایسا ہے دوبارہ ہو بھی سکتا ہے
ضروری تو نہیں ہر وقت اُس کا ساتھ ہی رہنا
اُسے کہنا مرا تجھ سے کِنارا ہو بھی سکتا ہے
تعلق توڑ کر جینا اُسے مشکل نہیں لگتا
کبھی میری طرف اُن کا اشارہ ہو بھی سکتا ہے
یہ اُس نے آج پوچھا ہے، بتانا سچ مجھے اعظم
محبت کے بِنا اپنا گزارا ہو بھی سکتا ہے؟

دشمنوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں
دوستوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں
کوئی ساتھی نہیں مرے غم کا
نفرتوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں
منزلیں دُور ہو گئیں ساری
راستوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں
ہر کوئی مطلبی یہاں پر ہے
آئینوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں
آ کے ملنا میں پیار سے' لیکن
الجھنوں میں گِھرا ہُوا ہوں میں

فروغِ ادب کے لیے وقف

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
لاہور
بُک ڈائجسٹ
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ

براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری/نثر) کمپوز کروا کے ان پیج میں ای میل کر دیا کریں۔
bookdigest@hotmail.com

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں رسالے کے حصول کیلئے سالانہ زرِ تعاون مبلغ 1000/- روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے۔لیے منظور شدہ
بُک ڈائجسٹ
0333-4377784

ہم تیری نگریا میں آئے

نیلم احمد بشیر/لاہور

میری بھانجی پنکی بہت خوش مزاج، چنچل، نٹ کھٹ اور زندہ دل ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی پارٹی، ہنگامہ، شغل میلہ، گیٹ ٹوگیدر کرتی رہتی ہے اور اپنے ایریا کے لوگوں میں ہر دلعزیز اور پسندیدہ شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ ورجینیا سٹیٹ کے خوبصورت ٹاؤن الیگزانڈریا میں پیدا ہوئی اور پھر وہاں سے کبھی ہلی نہیں۔ وہیں پڑھائی مکمل کی، وہیں شادی رچائی اور اب وہیں اپنے انجینئر شوہر اور دو ننھے بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہی ہے۔

میں جب بھی امریکہ جاتی ہوں اس کے ٹاؤن ضرور جاتی ہوں۔ چند دن اس کے ساتھ گزارتی ہوں تو خوب لطف رہتا ہے۔ ہم دونوں سال بھر کی جمع شدہ گپ شپ اور گوسپ کرتے ہیں ہنستے بولتے، گانے بجاتے، کھانے کھاتے ہیں اور اپنے دل خوش کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ پنکی میوزک اور مووِیز کی بھی بہت شوقین ہے اس لیے ہماری ملاقاتیں دلچسپ اور رنگین رہتی ہیں کسی لحاظ سے بھی روکھی، پھیکی یا بورنگ نہیں ہوتیں۔

میں پچھلی سردیوں کے اواخر میں اُسی کے پاس ٹھہری ہوئی تھی جب اس نے مجھے ایک ویک اینڈ پر کسی فرینڈ فیملی کے ہاں ڈنر پارٹی کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر قریشی کی فیملی اپنے ایریا میں کسی پرانی ریٹائرڈ فلم سٹار کو شفٹ ہو جانے پر ویلکم کرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کون تھی وہ؟ میں نے پنکی سے کریدنا چاہا مگر اس امریکن بارن بچی کو ہماری برسوں پرانی پاکستانی فلم سٹاروں کا بھلا کیا پتہ ہو سکتا تھا؟ سو اس نے تو نفی میں سر ہلا دیا۔

”آپ خود ہی چل کر دیکھ لینا خالہ آپ کو تو ویسے بھی این ٹیکس سے ہمیشہ بہت دلچسپی رہتی ہے۔“ پنکی نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا تو میں مسکرا دی اور پنکی کے ساتھ ڈنر پارٹی پر چلنے کو تیار ہو گئی۔

ہفتہ کی شام کو ہم لوگ اچھی طرح تیار ہو کر، بن ٹھن کر قریشی فیملی کے ہاں چل دیئے۔ قریشی صاحب نے تیس چالیس برسوں میں امریکہ میں خود کو ہر طرح سے آسودہ کر لیا تھا۔ ان کی کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی خوبصورت کرسٹل اسٹیٹ کا سرسبز میدان کسی جنت کا نمونہ دکھائی دیتا تھا۔ Estate کا گیٹ مہمانوں کی آمد کے لیے آٹومیٹک طریقے سے کھلتا اور بند ہو جاتا تھا۔ شاندار طویل ڈرائیوے کے دونوں جانب خوبصورت پھولوں کی روشیں تھیں جن سے مکینوں کی خوش ذوقی کا پتہ ملتا تھا۔ ”کیا یہ وہی مشہور و معروف ڈاکٹر قریشی کی فیملی ہے جن کے بارے میں تم نے پچھلے برس مجھے وہ قصہ سنایا تھا؟“ میں نے خوبصورت مینشن اور کشادہ لان کو دیکھتے ہوئے پنکی اور اس کے شوہر سے سوال کیا۔

”جی ہاں یہ وہی والے ہیں۔“ پنکی کا نوجوان شوہر جواد مسکرا کر بولا۔ ”اَن بی لیو ایبل!“ میں نے دھیرے سے کہا اور یاد کرنے لگی کہ پنکی نے پچھلے سال اپنی پاکستانی کمیونٹی لوکل نیوز کے بلیٹن میں مجھے یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر قریشی نے اپنی پہلی بیٹی فرزین کی شادی بہت ہی شان و شوکت سے کی تھی۔ آنے والے مہمانوں کے لیے بے تحاشا تحائف تھے۔ خواتین کو سونے کے کڑے دیئے گئے تھے اور ساری شادی پر ڈیکوریٹ کرنے والے پھول خاص طور پر چارٹرڈ جہاز میں جزیرہ ہوائی سے منگوائے گئے تھے۔ کئی دن میوزک فنکشن اور بھنگڑا پارٹیاں رکھی گئی تھیں اور پاکستان سے بلوائے گئے ڈھولچی ڈھول پیٹ پیٹ کر رونقیں لگاتے رہے تھے۔ اچھا تو آج ہم بھی ڈاکٹر قریشی کے مینشن کو اندر سے دیکھیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ ان کے گھر میں بہت سے نادر مجسمے موجود ہیں جو انہوں نے دنیا جہان سے خرید کر جمع کیے ہوئے ہیں۔ یہ مجسمے اتنے بیش قیمت تھے کہ ان کی مالیت کروڑوں ڈالر تک جا پہنچتی تھی۔ ایک بار ٹی وی پر ان کا گھر اور مجسمے دکھا کر یہ بتایا گیا تھا کہ ان مجسموں کی سالانہ صفائی پر ہزاروں ڈالر تک جا پہنچتی تھی۔ ایک بار ٹی وی پر ان کا گھر اور مجسمے دکھا کر یہ بتایا گیا تھا کہ ان مجسموں کی سالانہ صفائی پر ہزاروں ڈالر کا خرچہ اٹھتا ہے۔ مہمانوں کو میڈ اور بٹلر نے بڑی عزت سے بہت بڑے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مودبانہ انداز میں آرڈر لے کر بڑی پھرتی سے انواع و اقسام کے مشروبات سے گلاس بھر بھر کے لانے لگے۔

”مجھے تو لگ رہا ہے میں لوسٹوری فلم میں ہیرو کے ماں باپ کے گھر میں آ گئی ہوں۔ شان و شوکت تو بالکل ویسی ہی ہے۔“ میں نے ایپل سائڈر Apple cider کی چسکیاں لیتے ہوئے قریشی فیملی کے مینشن کو اندر سے بغور دیکھتے، جانچتے ہوئے پنکی سے سرگوشی کی۔

”اور آپ کہتی ہیں، میں فلموں کی دنیا میں جیتی ہوں؟“ میری بھانجی پنکی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے مجھ پر طنز کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ فلموں کا شوق

مجھے بھی کافی ہے مگر میں یہ مان کے نہیں دیتی اور یوں ہم دونوں خالہ بھانجی کی آپس میں نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔مزا رہتا ہے۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین، دل تھام کر بیٹھیے۔آپ سے ملنے آرہی ہیں مادام سلیمہ خانم۔'' قریشی صاحب نے مکمل امریکن انداز میں اپنے شاندار وائن گلاس کو نازکی سے بجاتے ہوئے اعلان کیا۔سبھی دروازے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں نے بھی اپنی پُر اشتیاق نگاہیں اُسی جانب جما دیں اور سلیمہ خانم کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔تقریباً پینسٹھ ستر سال کی عمر والی سلیمہ خانم بڑے شاہانہ انداز میں اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے سفید ستاروں والی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا جھلمل کرتا پلو روشنیاں بکھیرتا جھلملاتا نظر آتا تھا۔وہ اب بھی بہت خوبصورت تھیں۔میدے کی سی رنگت والا پروقار شہابی چہرہ، بڑی بڑی ذہین آنکھیں، انداز میں تمکنت، اپنے سٹار سٹیٹس کا احساس سب کچھ مل کر ان کی شخصیت کو بہت جاذب نظر اور منفرد بنا رہا تھا۔

میری نگاہوں میں یکدم فلیش بیک سا جھما کا ہوا اور میرے ذہن کے پردہ سیمیں پر پرانی فلموں کے پراجیکٹر آن ہوگئے۔ پنکی تو کچھ نہ جانتی تھی مگر مجھے اچھی طرح علم تھا کہ سلیمہ خانم ہمارے ملک کی کتنی بڑی اور مقبول فنکارہ ہوا کرتی تھیں۔ان کی مشہور فلمیں بھلا کون بھول سکتا ہے۔ میں نے بھی اُن کی مقبول فلمیں دیکھ رکھی تھیں اور اب ان کی مشہور فلموں کے مناظر اور نغمے میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ان کے حسن کے آگے کسی کا دیا نہ جلتا تھا اسی لیے اپنے وقت کے ایک مشہور ہیرو، شادی شدہ ہونے کے باوجود ان کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ بالآخر دونوں نے شادی کر ہی لی اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے لگے بعد میں سلیمہ خانم نے ان کی پہلی بیگم کو اپنی دوست بنالیا تھا۔

''الفت کی نئی منزل کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں......' سلیمہ خانم کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں ان کے زمانے کی ایک مشہور زمانہ فلم کا گانا گونجنے لگا۔

یادوں کی بہت سی چڑیاں باری باری آکر ذہن کی کھڑکیوں میں بیٹھنے لگیں۔ میں بھی یکدم بہت دور بہت سال پیچھے چلی گئی۔کسی اور زمانے میں، کسی اور کیفیت میں، کسی اور احساس میں کچھ ایسے کھوگئی کہ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ فلیش فارورڈ میں اب ایک عمر رسیدہ، عہد گزشتہ کی بھولی ہوئی داستان کو اپنے سامنے، اپنی اصل جگہ سے اتنی دور سانس لیتا دیکھ رہی ہوں اور کمرے میں موجود بہت سے لوگ پرانی نسل کی اس فنکارہ کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔

''مادام۔ آپ ابھی تک بہت چارمنگ، خوبصورت اور پرکشش ہیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر اُن کا جھریوں سے بھرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر محبت سے دباتے ہوئے کہا۔مادام سلیمہ کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ کھیل گئی اور انہوں نے اپنا چمکتا ہوا پلو بے نیازی سے اپنے بھرے بھرے سینے پر برابر کرنا شروع کردیا۔

''آپ کے زمانے میں بیشتر فلمیں اچھی ہوتیں اور ان کی موسیقی اور گیت لاجواب ہوتے تھے جیسے..... وہ گانا تم جگ جگ جیو مہاراج رے.....ہم تیری نگریا میں آئے.....وہ نغمے.....ہمارے لاشعور کی تہوں میں اب تک کتنی خوبصورتی سے محفوظ ہوئے۔'' قریشی صاحب نے اپنے وائن گلاس کو ری فل کرتے ہوئے مادام کو کمپلی منٹ دیا۔مادام لجا سی گئی۔''ڈاکٹر قریشی صاحب اب تو ہم بھی آپ کی نگریا میں آگئے ہیں.....'' مادام نے دلنواز مسکراہت سے پھر لجا کر کہا۔

''ویلکم ویلکم......مادام......یو ایس اے کو اپنا گھر سمجھئے۔ ہمارا اختیار شدہ وطن اب تو آپ کا بھی ہے.....یہ بتائیے آپ کے ساتھ کون ہے؟ میرا مطلب فیملی؟''مسز قریشی نے سوال کیا۔

''میری بیٹی اور ایک بیٹا بھی ہے.....انہی کے ساتھ ہوں۔'' مادام سلیمہ نے مختصر جواب دیا۔

''ان کا بیٹا تو پہلے سے ہی امریکہ میں رہتا تھا۔ یہ اب آئی ہیں۔'' کسی نے ہولے سے کہا۔

''تو آپ مادام؟ میرا مطلب ہے آپ کا شغل یہاں کیا ہوگا؟''

ایک مہمان نے سوال کی''میرا مطلب ہے کوئی ایکٹی وٹیز.....فلم؟''

''بھئی میں تو اب آرام ہی کروں گی۔ ساری عمر فن کی خدمت کی، آپ لوگوں کو انٹرٹین کیا..... بچے کہتے ہیں مما آپ بس لائف کو انجوائے کریں، ٹی وی دیکھیں، اپنے فینز سے ملیں، انٹرویوز دیں، ریلیکس کریں۔'' مادام نے جواب دیا۔

''گڈ......گڈ......وری گڈ.....اس میں شک ہی کیا ہے کہ آپ نے ہماری فلمی دنیا کو اپنی حقیقی ایکٹنگ کے اتنے حسین شاہکار دیئے ہیں، اپنے حسنِ فن سے نکھارا ہے۔'' ایک اور خاتون آگے بڑھ کر قریب ہوگئیں۔

''فرینڈز آج یہاں ہم مادام سلیمہ کے زمانے کی فلموں کے کچھ مشہور و مقبول گانے بجائیں گے اور ماضی کی حسین یادوں کو تازہ کریں گے۔'' قریشی صاحب نے اعلان کیا تو حاضرین نے تائید میں زور زور سے تالیاں بجانا شروع کردیں۔ پنکی بھی مادام سلیمہ خانم کی اتنی پذیرائی دیکھ کر کچھ متاثر نظر آنے لگی۔

"Wow" خالہ.....یہ تو کوئی بڑی گرینڈ فلم سٹار ہوں گی جو سب لوگ اس طرح انہیں عزت دے رہے ہیں۔'' اس نے پُر اشتیاق انداز میں مجھ سے

کہتے ہوئے مادام کی جانب غور سے دیکھا۔
''تو اور کیا'' سمجھ لو کہ یہ ہماری الزبتھ ٹیلر ہوا کرتی تھیں...... لیکن مائنس اُن کی شادیاں...... ہاں سلیمہ خانم نے ایک ہی کی تھی......'' میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ پنکی اور میں دونوں ہنس پڑے۔
''چلئے چلئے...... سب لوگ پلیز ہمارے لان میں چلیں...... اور گھبرائیں نہیں وہاں بھی سیٹنگ کا انتظام ہے...... کافی اور کیک وہیں سرو کیا جائے گا۔''
قریشی صاحب نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور خود سب سے پہلے اپنے مہمانوں کو راستہ دکھاتے ہوئے اپنے حسین لان کی طرف چلنے لگے۔ سب کچھ حیران سے ہو کر ان کے پیچھے پیچھے ہولئے۔ اور چند ہی لمحوں میں میزوں کے اردگرد رکھی خوبصورت کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔ ویٹرز آگے بڑھ کر کیک اور کافی کی پلیٹیں رکھنے لگے تو ہم نے بھی اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔ کیک کے ساتھ ساتھ گرما گرم سموسوں سے سجے تھال بھی گردش کرنے لگے۔ جنہیں سب نے چٹنیوں کے ساتھ لگا کر چٹخارے لے لے کر کھایا۔ سموسے بہت ہی خستہ اور مزے دار تھے۔ منٹوں میں چٹ ہوتے نظر آنے لگے۔
''کیسے ہیں؟'' مادام سلیمہ نے اپنے قریب بیٹھی خاتون کو سموسہ کھاتے دیکھ کر پوچھا۔
''بہت ہی مزے دار...... آپ بھی لیجئے۔''
خاتون نے جواب دیا تو مادام نے بھی ایک سموسہ اٹھا لیا اور اپنے نیل پالش سے سجے ہاتھوں کی انگلیوں میں نفاست سے تھام کر مزے لے لے کر کھانے لگیں۔
''اٹینشن لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔'' اب ذرا خاموشی اختیار کیجئے۔ آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے......'' قریشی صاحب نے پھر سے اعلان کر کے مہمانوں کو متجسس کر دیا۔ ڈاکٹر قریشی صاحب نے اپنے کسی کام کرنے والے کو سر سے اشارہ دیا اور یکدم فضا میں ایک تبدیلی آگئی۔ لان میں لگے ہوئے اونچے لمبے میپل اور ایور گرین کے درختوں سے مادام سلیمہ کی پرانی فلموں کے نغمے پھوٹنے لگے۔ پھولوں کی روشنیوں میں کھڑے قدیم یونانی، اطالوی، ایرانی مجسمے بھی موسیقی سے جی اٹھے۔ کہیں Zeus نغمہ سرا تھا تو کہیں کیوپڈ، کہیں سائیکی گنگنا رہی تھی تو کہیں اپالو، سورج دیوتا کا جسم جوشِ موسیقی سے لرز رہا تھا۔
''یہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے پنکی کی طرف دیکھا۔
''میوزیکل Trees خالہ...... دراصل قریشی صاحب میوزک لور ہیں۔ انہوں نے اب اپنے درختوں میں اسپیکرز لگوا لیے ہیں تا کہ وہ اپنے من پسند نغمے اپنے لان میں بھی بیٹھ کر سن سکیں۔ پنکی نے ماڈرن دنیا کے ایک ماڈرن کرشمے کے بارے میں مجھے معلومات دیتے ہوئے کہا۔'' واہ بھی مان گئے...... کیا زبردست آئیڈیا ہے۔'' اور سلیمہ خانم کی یہ دلکش انداز کی قدر افزائی!...... میں قریشی صاحب کی ذہانت اور حسِ جمالیات کی دل سے قائل ہو چکی تھی۔ سرسبز خوبصورت درختوں سے ملکۂ ترنم نور جہاں کے جادو بھرے نغمے سن کر تو روح بھی جھوم رہی تھی۔ نغموں کی تانوں کی گونج سے ان میں چھپی چڑیاں اور بلبلیں بھی ان میں اپنا راگ ملا کر گاتی محسوس ہوتی تھیں۔ امریکہ کے ایک سرسبز لان میں پاکستانی نغموں کا سحر بکھر رہا تھا اور مادام سلیمہ کا خوشی سے دمکتا شہابی چہرہ اور کھلے جا رہا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں، ہاتھ دھیرے دھیرے تال دے رہے تھے اور سب کچھ بہت دلچسپ، بہت مزے دار اور پرلطف لگ رہا تھا۔ مجسمے بھی گنگنانے لگے تھے۔
پروگرام کے آخر میں قریشی صاحب اور ان کی بیوی نے مائیک پر حاضرین کی آمد اور مکمل دلچسپی کا شکریہ ادا کیا اور پھر مادام سلیمہ خانم سے مودبانہ درخواست کی کہ وہ آئیں اور آ کر مہمانوں سے چند باتیں کریں۔ مادام اٹھیں تو سب نے اُن کے احترام میں کھڑے ہو کر زور زور سے تالیاں بجائیں۔ پنکی اور اس کی جنریشن کی چند لڑکیاں اور لڑکے بھی اپنے بڑوں کو دیکھا دیکھی شامل ہوگئے اور ایک جشن کا سا سماں پیدا ہوگیا۔
کتنی اچھی بات ہے کہ ہماری اتنی سینئر اور قابلِ احترام فنکارہ کی اس دور دیس میں اتنی پذیرائی ہو رہی ہے۔ مہذب تو میں اپنے اثاثوں کی اسی طرح قدر و منزلت کرتی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر ڈرائیووے میں مادام سلیمہ کو کسی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ کر میں بھی پنکی اور اس کے شوہر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگئی۔ فنکشن بہت دلچسپ رہا تھا۔ ہم راستے میں اسے ہی ڈسکس کرتے رہے۔
پنکی بھی میری طرح بہت چسکوری ہے۔ اکثر شام ہم دونوں گاڑی میں بیٹھتیں اور کسی قریبی ٹاؤن کے انڈیا بازار جا کر چاٹ، سموسے اور دہی بھلے کھا کر آتیں۔ ایک روز اسی طرح ہم دونوں کا موڈ بنا کر سلور سپرنگ کے دیسی بازار جا کر پہلے پیٹ پوجا کریں اور پھر اس کے بعد سینما میں جا کر کوئی نئی انڈین فلم بھی دیکھیں۔ سیٹ بیلٹیں کسے ہم دونوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی گانے بھی لگا لیے اور پنکی ہائی وے بیلٹ پارک وے پر گاڑی دوڑانے لگی۔ اس روز موسم بہت سرد تھا۔ گزشتہ روز کی برف باری کی وجہ سے سڑکوں کے کنارے لگے برف کے اونچے اونچے ٹیلے کسی ہالی وڈ مووی کا سا سین پیش کر رہے تھے۔ حسبِ معمول

برف صاف کرنے کو سڑکوں پر نمک ڈالا گیا تھا جس سے برفیں پگھل جاتی ہیں اور ڈرائیونگ میں دشواری کچھ کم ہو جاتی ہے۔ اسی نمک کو کھانے والا ایک چھوٹا سا نیولا نما جانور بھی نہ جانے کہاں سے نکل آتا ہے جو اکثر ہائی وے پر چلنے والی تیز رفتار گاڑیوں کے پہیوں تلے کچلا جاتا ہے۔ ایسے کتنے ہی جانور ہمیں ہائی وے پر پڑے نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں گانے سنتی ہوئی قہقہے لگاتی اپنی ایگزٹ کے پاس پہنچ چکی تھیں اور اب گرم گرم جلیبیاں، سموسے اور کھٹی میٹھی چاٹ کھانے میں کچھ زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا کہ میری نظر ایک ذیلی سڑک پر پیدل چلتی ہوئی دو عورتوں پر پڑی جو اپنے لباس کے لحاظ سے انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتی تھیں۔ ''ہائے بے چاریاں۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کیسے ہاتھوں میں تھیلے اٹھائے برف میں پیدل چلے جا رہی ہیں۔ دونوں نے کوٹ پہن رکھے تھے اور سروں پر دوپٹے لے رکھے تھے مگر سردی اور برف کے اس شدید موسم میں دستانے اور اونی ٹوپیوں کے بغیر ان کا یوں باہر نکلنا بہت غلط لگ رہا تھا۔ ایک کا کوٹ سرخ اور دوسری کا سیاہ رنگ کا تھا مگر حالت ان کی کافی پھٹیچر نظر آتی تھی۔ غالباً ان دونوں کے پاس کار نہ تھی اسی لیے یوں..... میں نے دل میں افسوس کی ایک لہر اٹھتی محسوس کی مگر پھر چند ہی لمحوں بعد پنکی نے گاڑی روک کر مجھے احساس دلا دیا کہ ہم اپنی منزل مراد پر پہنچ چکے تھے۔

انڈین بازار پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے ایک بوتیک پر کپڑے دیکھے، پھر اس کے بعد سنگر عاطف کی نئی کیسٹ لی۔ اس وقت تک بھوک بہت چمک چکی تھی سو ہم نے سوچا اب راج بھوگ ریستوران پہنچ کر آرام سے بیٹھیں اور دیسی فوڈ کے مزے لیں۔

سب سے پہلے ہم نے سموسوں اور جلیبیوں کا آرڈر دیا اور خود سامنے کی سکرین پر لگی انڈین مووی کے تھرکتے ہوئے مستی بھرے ناچ دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جلیبیاں تو آ گئیں مگر سموسے نہ آئے۔ حیرت کی بات تھی۔

''ہم نے سموسے بھی منگائے تھے۔'' پنکی نے ویٹر کو یاد دلایا۔

''سوری میڈم۔ سموسے میں کچھ دیر ہے..... آئے نہیں..... بس آنے ہی والے ہیں۔''

''ہیں! سموسے..... کیا انڈیا سے آ رہے ہیں؟'' میں نے مذاقاً کہا تو ویٹر بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ راج بھوگ کے مالک آنند تیواڑی صاحب کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ہمارے پاس آ گئے اور معذرتانہ لہجے میں کہنے لگے۔

''سوری میڈم۔ بس تھوڑی ہی دیر میں ہماری سپلائی آنے ہی والی ہے۔ آپ کو میں کمپلی منٹری بھیل پوری بھجوا دیتا ہوں۔ آپ پلیز انجوائے کریں۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔ سموسے رہنے دیں..... ہم بھیل پوری سے بھی خوش ہو جاتے ہیں، اگر فری میں ملے تو.....'' پنکی نے بھی مذاق کیا تو تیواڑی صاحب مسکرا دیئے۔ ہم نے بھیل پوری اور جلیبی سے دل بہلایا اور پنکی کاؤنٹر پر پیسے ادا کرنے لگی۔ میں ہاتھ دھونے کو کونے میں لگے سنک کے قریب کھڑی ہو گئی اور صابن لگا کر گرم پانی کی ٹونٹی کھول دی۔ یکا یک میرے کانوں میں تیواڑی صاحب کی غصہ میں بھری آواز سنائی دی۔ لگتا تھا وہ کسی کچن ورکر کو ڈانٹ رہے ہیں۔

''کتنی بار کہا ہے کہ آپ ٹائم سے سموسے پہنچا دیا کریں۔ کتنے کسٹمر یونہی چلے جاتے ہیں۔ آپ کو وقت کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ روز آرڈر پہنچاتے ہیں آپ۔''

جواب میں ایک مہین سی نسوانی آواز نے کچھ کہا جو مجھے سنائی نہیں دیا۔

''بھئی اگر پیدل آنے میں ٹائم لگتا ہے..... تو گاڑی خرید لیں۔ یہ میرا پرابلم نہیں ہے۔ اس طرح تو میرا بزنس خراب ہوتا ہے۔ آپ کو ٹائم پر سموسہ پہنچانا ہے تو بات کریں ورنہ آئی ایم سوری..... آپ لوگ یہ جاب چھوڑ دیں۔'' تیواڑی صاحب کی آواز مزید بلند ہو گئی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے پردہ ہلکے سے سرکا کر دیکھا۔ دو خواتین شرمندہ سی چپ کھڑی تھیں اور تیواڑی صاحب گرج برس رہے تھے۔ ایک خاتون کا کوٹ سرخ اور دوسری کا سیاہ تھا۔ میں ان کے چہرے دیکھ نہ سکتی تھی مگر ان کے کپڑوں پر لگے ہوئے چکنائی کے داغ دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

''چلیے جائیے اب جا کر کچن ٹریز میں سموسے سیٹ کریں۔ آج آپ کی آخری وارننگ تھی اگر کل ایسا ہوا تو میں آپ کو نہیں رکھوں گا سوری۔'' تیواڑی صاحب کچھ نرم سے پڑ گئے۔

خواتین نے رخ پلٹا اور جلدی جلدی کچن کاؤنٹرز کی ٹریز میں سموسے سیٹ کرنے لگیں۔ دونوں دیکھنے میں ماں بیٹی سی لگتی تھیں۔ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ جھنجھلا کر سموسے اوپر نیچے رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ شاید ضبط کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ مادام سلیمہ خانم البتہ بہت تحمل اور سلیقے سے ٹرے میں سموسے سجا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ٹرے کے کونوں کو ٹشو سے صاف بھی کرتی جا رہی تھیں۔

دھوکا

تسنیم کوثر/لاہور

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

فون کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی مجھے نیم بیدار کر گئی تھی۔

میں نے کسلمندی سے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا......مُندی مُندی آنکھوں سے نمبر دیکھنا چاہا اور پھر......

جیسے کسی نے پوری قوت سے میری آنکھیں کھول دیں...... میں گھبرا گئی۔

فون چندا کا تھا۔

ہیلو! ہیلو...... میں بولتی گئی...... دوسری طرف کوئی آواز نہ تھی۔

میرا جی ہولنے لگا۔

بس اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

مجھے لگا! جیسے میرے جسم کا خون نچوڑ لیا ہو کسی نے۔

آج ہی تو اسے رخصت کیا تھا میں نے......ذہن میں طرح طرح کے وسوسے رینگنے لگے۔

وُہ میری ماں جائی تو نہیں تھی مگر...... مجھے عزیز بہت تھی گزشتہ اٹھارہ برس سے وُہ میرے ساتھ تھی...... یارُخ کی پیدائش پہ وُہ میرے پاس آئی تھی بس تب سے اب تک وہ میرے ساتھ ہی تھی۔ میرا پورا گھر اُسی کے سر پر چل رہا تھا...... وُہ میرا اور میں اس کا سہارا تھی بلکہ...... مجھے اس کی ضرورت تھی...... میں اس کے بناء ادھوری تھی کیونکہ

میرا تو پورا دن دفتر میں گزر جاتا تھا۔ میں اور شجاعت دونوں پرائیویٹ ملازمت کرتے تھے اس لیے......

ہمیں سرکاری ملازمین کی سی عیش میسر تھی نہ فراغت۔

ہم میاں بیوی کی حد تک تو ٹھیک تھے...... میں جیسے تیسے گھر سنبھال لیتی تھی مگر......

یارُخ کے ساتھ نوکری کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا تھا۔ جتنی توجہ بچے کے لئے ضروری ہوتی ہے میں نہیں دے پارہی تھی۔

گھر، دفتر اور بچہ......

یہ سب شعبے مجھ سے نہیں سنبھل رہے تھے...... میں روہانسی ہو رہی تھی...... شجاعت بھی پریشان تھے...... اس مشکل کو حل کرنے میں لگے تھے کہ اچانک ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔

شجاعت کے نائب قاصد نے اپنی بھتیجی ہمارے سپرد کردی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد یہ بچی اپنے عزیز رشتہ داروں میں شٹل کاک بنی ہوئی تھی۔ کبھی کسی بہن بھائی کے گھر چلی جاتی...... کبھی کوئی رشتہ دار اپنے گھر کام کاج کے لیے بُلا لیتا۔

ہم ضرورت مند تھے اور وُہ بھتیجی کی ذمہ داری سے چھٹکارہ پانے اور اپنی آمدن بڑھانے کے چکر میں تھا۔ سو ہم نے اسے مستقل ملازم رکھ لیا مگر...... یارُخ کو پالنے سے پہلے مجھے اس کی تربیت کرنا پڑی...... اس اُجڈ، گنوار سی کھلنڈری بچی کو اپنے مطابق ڈھالنے میں مجھے بہت وقت لگا۔

پہلے پہل وُہ صرف یارُخ کو سنبھالتی تھی۔

یارُخ بڑا ہوا تو میں نے اسے گھرداری سکھانا شروع کی...... آہستہ آہستہ اپنے گھر کے طور طریقے سمجھائے اور اب......

وُہ ہمارے ساتھ اتنا رچ بس گئی تھی کہ میرے گھر کی ذمہ داری، مجھ سے زیادہ اس کے کاندھوں پر تھی...... مجھ سے زیادہ میرے گھر کی خبر گیری تھی اسے۔

کبھی جب وُہ اپنے عزیز رشتہ داروں سے ملنے جاتی تو میرا گھر...... اندھیر نگری بن جاتا۔ کوئی چیز کہاں رکھی ہے مجھے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ میں بولائی بولائی پھرنے لگتی......

چندا نے مجھے ہر فکر سے آزاد اور گھر سے غافل کردیا تھا۔

وُہ دس برس کی تھی جب میرے پاس آئی اور اب......اٹھارہ برس سے وُہ میرے ساتھ تھی۔

اس کے عزیز اسے واپس بلاتے تھے مگر میرے گھر کی عادت اسے کہیں جانے ہی نہ دیتی تھی......ایسی خود مختاری اسے کہاں ملتی؟......شہری زندگی نے اس کے خیالات بھی تو اونچے کردیئے

تھے اور اب...... ۔
وہ کسی شہزادے کے انتظار میں تھی۔
پُرتعیش زندگی کے خواب سجائے بیٹھی تھی۔
اسے کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آتا تھا......اب بھی ایک رشتہ زیرِ غور تھا جو چندا کی بہن کی کسی ملنے والی نے بتایا تھا۔
آدمی بڑی عمر کا تھا مگر تھا مالدار۔
شہر کی نواحی بستی میں رہتا تھا ......آٹھ بھینسیں تھیں ......شہر میں دودھ سپلائی کرتا تھا ......ٹھیکے پہ کچھ زمین لے رکھی تھی ......جس پہ خود وائی بیجی کرتا تھا......
اس کی اپنی حویلی تھی ......ڈھور ڈنگر تھے اور ساتھ میں ایک بیوی بھی تھی۔سب کچھ تھا اس کے پاس بس......
اولاد ہی نہ تھی
یہ رشتہ لے کر بھی اس کی پہلی بیوی ہی آئی تھی ۔
ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں آنسو لیے
میرے پاؤں پکڑ کر فریاد کرتی ہوئی جھولی پھیلائے ہوئے
چندا کو میری جھولی میں ڈال دیں جی۔
مجھ پہ کرم کردیں جی۔
شریکا برادری ہمارے مال پہ نظر رکھے ہوئے ہے
ہمیں وارث چاہیے......وہ گڑگڑا رہی تھی
میں بیٹیوں کی طرح رکھوں گی اسے مگر
میں چندا کی مرضی کے بغیر کیسے ہاں کر دیتی؟
بہنوں نے اسے سمجھایا...... میں نے اونچ نیچ بتائی......ساری حقیقت سے آگاہ کیا......
گو دونوں کی عمروں میں فرق تھا مگر اس کی حویلی اور ڈھور ڈنگر چندا کو بھی متاثر کر گئے اور اس نے ہاں کردی
اس رشتے میں چھان بین کی ضرورت ہی نہ تھی اور پھر ...... چھان بین تو ماں باپ کرتے ہیں۔بھابیاں بہنوئی یا عزیز رشتہ دار نہیں
چندا کی رخصتی میرے گھر سے ہوئی تھی ...... میں نے بیٹیوں کی طرح دے دلا کر اسے وداع کیا تھا......ٹی وی کی خصوصاً اس نے فرمائش کی تھی اور شجاعت اس کے لیے ٹی وی لے آئے تھے......اس کی خواہش تھی ......وہ بیوٹی پارلر سے تیار ہو......یا رُخ نے چندا باجی کے لیے یہ انتظام کردیا تھا۔
چندا کی آنکھوں میں اپنے گھر کے جو خواب سجے تھے وہ پورے ہونے کو تھے
میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے رخصت کیا تھا اور......
ابھی سحر پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں
کیا ہوا چندا؟ کچھ بولو تو...... میں بے تاب سی ہوگئی
بس باجی! قسمت خراب نکلی میری
دھوکا ہوگیا میرے ساتھ
کیسا دھوکا؟ کس نے کیا؟ ......حیرانی میرے لہجے سے جھلک رہی تھی اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی
وہ تو آیا ہی نہیں۔اس کی پہلی بیوی......
باجی!
اس کی سسکیاں جملہ مکمل ہی نہ ہونے دیتی تھیں
ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوگئی میرے سامنے
دھاڑیں مار کر رونے لگی پھر بولی
دیکھ چندا...... میں تیری گناہگار ہوں
مجھے معاف کردے۔تجھے دھوکا دیا......
ساری حقیقت جانتے ہوئے بھی تیری زندگی خراب کردی میں نے......
تجھے بیاہ لائی پر چندا
بڑا دُکھ سہا ہے میں نے
سسرال والوں نے بہت طعنے دیے مجھے
سارے پنڈ کے مہنے سہے میں نے
اپنے پرائے سب نے مجھ پر ہی انگلیاں اٹھائیں
پر چندا! کوئی اور جانے نہ جانے، مانے نہ مانے ......تو تو مانے گی نا اس حقیقت کو......تو گواہی دے گی میری کہ
میرا کوئی گناہ نہیں تھا
کوئی قصور نہیں تھا......قصور تو سارا......

مہلت......!

شہزاد تصور/ لاہور

نازش کو اپنے پراپرٹی ڈیلنگ کے دفتر کیلئے کرائے کی رقم کی اشد ضرورت تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ اچانک ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔ نظریں اٹھیں تو وہ جیسے ساکت ہو کر رہ گیا۔ کیا چہرہ تھا...... خطرناک حد تک تیکھے نقوش، ستواں ناک، گندمی رنگت اور دوپٹے میں چھپے سیاہ گھنیرے بال، انتہائی متناسب مجسم، سادہ لباس...... لیکن اس سادگی میں وہ بلا کا حسن کہ ایک لمحے کیلئے دل کی دھڑکن جیسے تھم کر رہ گئی ہو۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سراپا حسن و جمال تھی۔

''جی آپ کے پاس دو کمرے کا مکان کرائے کیلئے خالی ہے۔'' اس نے لب کھولے تو نازش کو یوں محسوس ہوا جیسے گلاب کی دو پنکھڑیاں کھلنے سے اس کے کانوں میں وہ رس گھل گیا ہو جس کے ذائقے سے قبل ازیں نا آشنا تھا۔

جواب دینے کی کوشش کی تو کچھ دیر کیلئے آواز حلق سے باہر نہ نکل سکی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش پر بمشکل تمام منہ سے نکلا۔ ''جی ہاں...... موجود ہے!'' پھر یوں ہوا کہ ہمت خود بخود بڑھتی چلی گئی اور کرائے اور ایڈوانس کے علاوہ دیگر تفصیلات بتائیں تو وہ مکان دیکھنے کی خواہش مند تھی۔

نازش نے بھی دیر نہیں لگائی اور اپنے اسسٹنٹ کی بجائے خود ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ راستے میں مختلف سوالات کرتا رہا جن کے جواب میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق اس کا نام شبانہ تھا اور شوہر ایک دور دراز قصبے میں رہائش پذیر تھا جس کے پاس فوج کے کسی محکمے کو پھل، سبزی اور گوشت وغیرہ سپلائی کرنے کا ٹھیکہ تھا۔ مالی لحاظ سے خاصا آسودہ جبکہ لاہور کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ وہ تین سالہ بچے کی ماں اور موجودہ مکان جہاں رہائش پذیر تھی مالک مکان سے معمولی جھگڑے کے نتیجے میں فوراً تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ نازش کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کامیاب ڈیل کے بعد حاصل ہونے والی کمیشن سے نہ صرف دفتر کا کرایہ ادا ہو جاتا بلکہ اور بھی کئی مسائل حل ہو جاتے۔ علاوہ ازیں اس مہ جبیں کی قربت کا احساس دل کو عجیب سرشاری میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔

مکان فوراً پسند کر لیا گیا۔ کرائے میں معمولی کمی کرانے کی خواہش بھی نازش کی پیشہ وارانہ مہارت کے ذریعے پوری ہو گئی۔ شبانہ نے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جانے کے بعد پرس کھولا اور کرائے اور ایڈوانس کی رقم کے علاوہ اس کی کمیشن بھی موقع پر ادا کر دی۔ کمیشن کی رقم پکڑتے ہوئے اس کی انگلیوں میں کپکپاہٹ تھی اور دل گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ مالک مکان کی طرف سے بھی کمیشن وصول ہونے کے بعد تو خوشی دو چند ہو گئی۔ اب کرایہ نامہ لکھنے کا مرحلہ درپیش تھا جس کیلئے اس نے دونوں فریقین سے ضروری کوائف حاصل کئے اور پھر مکان کی چابی شبانہ کے حوالے یہ کہتے ہوئے کر دی کہ پلیز شکایت کا کوئی موقع نہ دیجئے گا۔ اس کی طرف سے تسلی دلائے جانے کے بعد وہ اگلے روز کرایہ نامہ تیار کرنے کا وعدہ کر کے واپس اپنے دفتر کو ہو لیا۔

راستے بھر بار بار جیب سے دس ہزار کے نوٹ نکال کر یوں چومتا رہا جیسے اس قتالہ کے نازک لبوں کو چوم رہا ہو۔ پورے وجود پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ اس خمار کی تہ میں کوئی انجانی پیاس اندر ہی اندر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بے اختیار لبوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ لیکن شاید یہ کبھی ختم نہ ہونے والی تشنگی تھی۔ دفتر پہنچتے ہی اس نے اسسٹنٹ کو ڈیڑھ لیٹر کی سیون اپ بوتل لانے کیلئے کہا اور خود کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں پلکیں خود بخود ایک دوسرے سے جڑنا شروع ہو گئیں۔ کانوں میں مسلسل گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ یہ لمحے حسین ترین احساسات سے لبریز تھے۔

پھر دو ماہ گزر گئے۔ نازش کے معمولات وہی تھے۔ اپنے ہاں آنے والے ضرورت مندوں کو مکان کرائے پر دلا کر کمیشن وصول کرنا۔ ہوئی روزی تھی لیکن بہر حال گزارہ خوب ہو رہا تھا۔

ایک روز وہ کسی ضروری کام سے فارغ ہو کر ابھی دفتر پہنچا ہی تھا کہ شبانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا لمبے قد

کا ایک شخص بھی تھا۔ جسم فربہ اور عمر 50 سے اوپر رہی ہو گی۔ ''یہ میرے شوہر جبار صاحب ہیں۔'' اس نے چھوٹتے ہی تعارف کروایا۔

نازش نے بے اختیار مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو غیر محسوس طور پر اس نے دبا دیا۔ وہ چونکنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مصافحہ کرتے وقت ہاتھ دبانے والے لوگ فطری طور پر بزدل ہوتے ہیں۔ بہرحال اس نے نظرانداز کر کے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی۔ جب وہ صوفے پر براجمان ہو گئے تو نازش ہمہ تن گوش تھا۔ معلوم ہوا کہ اب پھر مکان تبدیل کرنا تھا۔ اس کا تو کاروبار ہی یہی تھا چنانچہ دو، تین مکان دکھائے گئے جن میں سے ایک منتخب ہوگیا اور پھر سارے معاملات طے پا گئے۔

کچھ عرصے بعد شام کے وقت وہ دفتر کے باہر کرسی پر بیٹھا تھا کہ اچانک سڑک سے گزرنے والی ایک خاتون پر نظر پڑی۔ دور سے اصل چہرہ تو دیکھنا مشکل تھا تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ فربہی مائل جسم اور چال کسی بدوضع پیکر کی نشانی ہے۔ کندھے پر پرس جھول رہا تھا اور ساتھ کوئی ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ دونوں ذرا نزدیک پہنچے تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ تو شبانہ تھی جس کا جسم خاصا فربہ ہو چکا تھا اور میک اپ زدہ چہرہ...... بال ترشے ہوئے...... لباس بھڑکیلا...... اور چال بالکل یوں جیسے...... مطلب...... ساری سادگی غائب ہو چکی تھی اور ہر ادا سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق انسانوں کے اس قبیلے سے ہے جسے معاشرہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

''اف اللہ! یہ کایا پلٹ...... کیا یہ وہی عورت ہے جسے پہلی مرتبہ دیکھ کر دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔'' وہ بس اتنا ہی سوچ سکا۔ دل میں غم واندوہ کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ نجانے کیوں احساس کا آبگینہ پارہ پارہ ہو کر رہ گیا تھا۔

شبانہ چونکہ اسے دیکھ چکی تھی اس لئے فوراً یوٹرن لینے والے انداز میں پلٹ آئی۔ ''نازش صاحب کیسے ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ساتھ موجود ادھیڑ عمر عورت جو شاید ملازمہ تھی خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

''جی اللہ کا شکر ہے......!'' منہ سے خودبخود نکل گیا۔

اس کے ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک بزبان خود کہہ رہی تھی کہ مجھے ضرورت سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ آتش شوق جو پہلی ملاقات میں یکبارگی بھڑک اٹھی تھی نجانے کیوں سرد پڑ گئی۔ نازش کیلئے شبانہ کو عورت سمجھنا اب ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے نزدیک یہ عورت کا بدترین روپ تھا۔ لیکن اس کے پیچھے کیا مجبوری چھپی تھی سمجھ سے بالاتر تھا۔ شوہر تو اس کا خاصا آسودہ حال تھا۔

''آپ کو حیرت تو ہوگی لیکن ایک مرتبہ پھر مکان چاہئے۔ جبار نے فون کر کے ہدایت کی ہے کہ آپ سے کہہ کر تبدیل کر لوں۔ نجانے کیوں اسے آپ پر اعتماد ہو گیا ہے۔'' شبانہ کے انداز میں ایک خاص طرح کی لگاوٹ کی جھلک نمایاں تھی۔

نازش کو اندر ہی اندر کچھ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ پھر مکان تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ وہ تو اس کی سادگی کا دیوانہ تھا لیکن وہ ایسا روپ دھار چکی تھی جو معاشرے کیلئے تو خیر جو بھی سہی اس کے نزدیک گھناؤنا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ یکے بعد دیگرے کئی مکان تبدیل کئے گئے۔ کبھی کبھار مالک مکان کی طرف سے شکایات بھی سننے میں آتیں کہ اجنبی مردوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ایک مکان جو تین دن پہلے کرایہ پر حاصل کیا گیا تھا اچانک مالک مکان جو خاتون تھی اس کی طرف سے دھمکی ملی کہ شام کا سورج ڈوبنے سے پہلے خالی کر دیا جائے۔ وجہ معلوم ہوئی کہ شبانہ کا شوہر جبار گزشتہ رات لاہور آیا تھا اور میاں بیوی کی خوب لڑائی ہوئی جس میں جبار نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا اور خون اتنا بہہ گیا کہ دیواروں پر چھینٹے پڑے تھے۔ نازش کو فوراً بلوایا گیا۔

شبانہ اپنے شوہر کی زیادتیوں کے گلے شکوے کرتے ہوئے اچانک پھٹ پڑی اور سچ اگل دیا کہ جبار نے تین شادیاں گاؤں میں کر رکھی ہیں جبکہ وہ منکوحہ نہیں بلکہ رکھیل ہے۔ وہ جب بھی لاہور آتا ہے دو، تین دن اس کے ساتھ گلچھرے اڑا کر واپس چلا جاتا ہے۔ باتوں باتوں وہ اتنی جذباتی ہوگئی...... یا پھر یہ ایک بہانہ تھا۔ بہرحال یہ کہتے ہوئے کہ جبار نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے جسم پر آئے زخم دکھانے کیلئے یکدم قمیض اتار دی اور بلاؤز بھی جھٹکے سے اتار دیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور سرعت سے ہوا کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔ لیکن اس نے فوراً آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور نظریں نیچے جھکا لیں۔

''آپ...... آپ'' سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے اور صرف ممیا کر رہ گیا۔ وہ بچہ نہیں تھا۔ خوب سمجھتا تھا کہ عورت کے یوں بے لباس ہونے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ زخم دکھائے بغیر بھی دکھ کا اظہار ہو سکتا تھا۔ ہمدردی کے دو الفاظ اسے مل سکتے تھے۔ اس کی بے اعتنائی پر شبانہ نے دوبارہ ستر پوشی کی اور شکایت آمیز انداز میں کہا۔ ''میں آپ سے بہت متاثر ہوں۔ لیکن آپ شاید کبھی نہ ہوں۔!''

''شبانہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ آپ کا مقصد شام سے پہلے مکان تبدیل کرنا ہے سو وہ پورا ہو جائے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں کاروباری آدمی ہوں اور بس......!'' اس نے رک رک کر جملے ادا کئے۔ البتہ اندر ایک طوفان برپا تھا۔ کمبخت موقع ضائع کر دیا۔ تم کہاں کے مہاتما ہو، اچھی طرح جانتے ہو اس گنگا میں ہر کوئی ہاتھ دھو رہا ہے، کنواں خود پیاسے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ احمق ہو تم، گدھے! اس نے بے خیالی میں گردن کو زور سے یوں جھٹکا جیسے ہر خیال سے چھٹکارا چاہتا ہو اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ مجھے پانی پلایئے۔ رہ گیا مکان تو ابھی دکھا دیتا ہوں۔''

وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پر مایوسی کے آثار تھے۔ اس کی تہ میں چھپے جذبات نازش کی فہم سے بالا نہ تھے۔

ایک اور مکان تبدیل ہو گیا۔ لیکن ڈیڑھ ماہ بعد ہی ایک روز ضعیف العمر مالک مکان بدحواسی کی حالت میں نازش کے سامنے کھڑا تھا۔ ''نازش بیٹا! غضب ہو گیا۔ چھاپہ پڑ گیا ہے!'' خلیل احمد کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

''کیا...... پولیس آئی ہے؟'' اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شبانہ کی بداعمالیاں رنگ لے آئی تھیں۔ اب وہ بھی پھنسے گا۔

''پولیس نہیں...... بلکہ وہ شخص جو اوپر والے پورشن میں شبانہ کے کمرے میں موجود تھا اس کی بیوی نے چھاپہ مار کر دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اس نے شبانہ کو تھپڑ مارے اور گالیاں بھی دی ہیں۔ سارا محلہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اب بہت ہو گئی۔ اس گند کو فوراً باہر نکالو۔'' خلیل احمد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔ تو یہ چھاپہ پولیس کا نہیں بلکہ ایک بیوی کا تھا۔ چلو پھر بچت کا پہلو نکل آیا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور سب کچھ چھوڑ کر خلیل احمد کے ساتھ چل دیا تاکہ شبانہ سے دو ہاتھ کر سکے۔ اب وہ بے قابو عورت تھی۔ نام نہاد شوہر دوسرے شہر میں مقیم تھا۔ بن بیاہی ماں سب کیلئے کھلی دعوت بن چکی تھی۔ اسے اب مکان دلانا خطرناک تھا۔

لیکن اسے دیکھتے ہی نجانے کیوں نازش کا غصہ سرد پڑ گیا۔ ''صرف یہی کہوں گا کہ جو مرضی کریں آپ کا فعل...... لیکن جہاں رہائش ہو وہاں ایسا کام......!''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب جھوٹ ہے۔'' اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ''جانتی ہوں آپ ہمدرد انسان ہیں، مجھے برا سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی ہر مرتبہ نجانے کیا سوچ کر مدد کرتے ہیں۔ آج بھی آپ کی ضرورت ہے۔ کل جبار آ رہا ہے، اس کے آنے سے پہلے مکان تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس حرامزادے خلیل احمد نے شکایت لگا دی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' اس مرتبہ اس کے لہجے میں لجاجت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

''نکاح کیوں نہیں کر لیتیں آپ جبار سے...... اب تو ایک بچہ بھی ہے۔ کبھی سوچا ہے کہ اس کا کیا بنے گا؟'' نازش کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

''وہ عیاش آدمی ہے۔ نکاح کبھی نہیں کرے گا۔ میں غلطی کر بیٹھی اور جھانسے میں آ گئی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کی عزت داؤ پر لگا کر اس کے سہارے گھر سے نکل آئی۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ میری زندگی یہی ہے اور بس۔ آپ پلیز مدد کیجئے۔ اچھی طرح جانتی ہوں آپ کو میرے جسم میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اچھے انسان ہیں۔ یہی سمجھیں کہ مشکل وقت میں آپ کی مدد میرے لئے آسانی پیدا کر دے گی۔'' لہجہ اب بھی لجاجت بھرا تھا۔

''مکان صبح سویرے ہی آپ کو مل جائے گا۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ اب کوئی شکایت نہیں آئے گی۔ بصورت دیگر یہ کام نہیں کر سکتا۔'' نازش نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''ہو گیا وعدہ......! آپ کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔'' اس نے یقین دلایا البتہ آنکھیں خلا میں تھیں جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ نازش نے غور سے اسے دیکھا۔ چہرے کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی تھی۔ دل میں کراہت کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے احساسات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گردن کو جھٹکا۔ شبانہ کے

انداز میں بازاری پن نمایاں تھا۔ بھٹکی ہوئی عورت کو شاید کبھی سکون نہ ملے۔ اس کے دل میں خود بخود یہ خیال یوں آ گیا، دم سحر اچانک پلٹ آئے شام جیسے!

اگلے روز نیا مکان...... ایک مرتبہ پھر سامان کی شفٹنگ...... جس کیلئے نازش نے اپنے اسسٹنٹ کو مدد کیلئے بھجوادیا اور یوں یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ پھر ایک روز خبر ملی کہ شبانہ کا نام نہاد شوہر جبار جو ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں چل بسا۔۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے چلے گئے۔ گاہے بگاہے مختلف آشناؤں سے معلومات حاصل ہوتی رہیں کہ فلاں بھی شبانہ کے ساتھ اور فلاں بھی اور پھر یہ فلاں کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

ایک روز یونہی دفتر میں بیٹھا تھا کہ اس کا لنگوٹیا ثمر ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ آ دھمکا۔ آتے ہی اس نے منت ساجت شروع کر دی۔ تمہیدوں کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ اصل بات بتانے سے گریز کیا جا رہا تھا۔

''مسئلہ کیا ہے، کھل کر بتاؤ۔'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

''اصل میں یہ میرا دوست تیمور ہے۔'' اس نے اجنبی نوجوان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اپنے دو خوشحال لیکن انتہائی قریبی دوستوں کے ساتھ مل کر شبانہ کو ہائر کیا۔ پیسے اس کے دوستوں نے ادا کرنا تھے کیونکہ یہ تو بیروزگار ہے۔ تینوں مل کر اسے گاڑی میں لے آئے اور ایک سنسان جگہ پر کھڑی کر دی۔ عین وقت پر وہ دونوں تو بہ کر گئے لیکن اس نے ان کی گاڑی میں شبانہ کے ساتھ......! ثمر کچھ دیر کیلئے رک گیا پھر توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''اب وہ اس سے پیسوں کا تقاضا کرتی ہے جو اس کے پاس نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اس کا گھر تلاش کر کے پہنچ گئی اور اس کی بہن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی رہی اور کہتی رہی کہ میرے ساتھ چلو ابھی پیسے مل جائیں گے۔ محلے میں خوب تماشہ لگا۔ یہ بہت شرمندہ ہے۔ اسے شبانہ سے پیسوں کی ادائیگی کیلئے ایک ماہ کا وقت لے دو۔ تمہارا احسان ہوگا، بے چارہ بہت پریشان ہے۔''

نازش حیرت سے دونوں کے چہرے دیکھنے لگا۔ ''میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس کے دماغ میں ہتھوڑے برس رہے تھے۔

''وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالے گی اور اسے کچھ وقت مل جائے گا۔ اس دوران یہ پیسوں کا انتظام کر لے گا۔ صرف مہلت ہی تو چاہئے......! ثمر اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

''بابا...... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں، اب وہ کہاں رہتی ہے؟'' نازش عجیب کشمکش میں تھا۔

''یہ ہم تمہیں بتاتے ہیں...... بلکہ تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔'' ثمر نے فوراً کہا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر ان کے ساتھ چل دیا۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

......تا سرزمینِ ترکی!

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

ہوائی جہاز سامنے کھڑا تھا۔

گلف ایئر کا عام سا ہوائی جہاز۔۔۔ جس کی منزل بحرین ایئرپورٹ قرار پائی تھی۔۔۔ اور پرواز کا دورانیہ تین ساڑھے تین گھنٹے کی اُڑان پر محیط تھا۔۔۔

اگر میں نے ''جہاز'' کے عنوان سے ایک نظم نہ پڑھ رکھی ہوتی تو شاید میرے ذہن میں اُن خیالات کا ورود ممکن نہ ہوتا جو اس پر نظر پڑتے ہی۔۔۔ میرے دامانِ تخیل کا حصہ بن رہے تھے۔

کچھ عرصہ پیشتر مَیں نے ''جہاز'' کے عنوان سے ذیشان ساحل کی نظم کی بابت ایک آرٹیکل پڑھا تھا جس میں رائٹر کا کہنا تھا کہ ذیشان ساحل کی یہ نظم ایک قصے کا بیانیہ ہے۔ اس قصے کے دو کردار ہیں ایک جہاز اور دوسرا اس میں سفر کرنے والی ایک حسینہ۔ نظم کہتی ہے کہ وہ حسینہ ایک محوِ پرواز جہاز پر عازمِ سفر ہے۔ جہاز کو اپنی اس مسافر کی موجودگی اتنی بھلی لگتی ہے کہ وہ سرشار اور بے خود ہو جاتا ہے۔۔۔ انتہائے مسرت کے مقام پر یکلخت اُسے خیال آتا ہے جب میں اپنے رَن وے پر لینڈ کر جاؤں گا تو یہ لڑکی بھی تمام دیگر مسافروں کی طرح ایئرپورٹ سے نکل کے شہر کی بھیڑ میں گم ہو جائے گی۔۔۔ وہ یہ سوچتا ہے اور آسمان پر چکر لگانے لگتا ہے۔۔۔ اسی اُدھیڑ بُن میں وہ بادلوں میں چھپنے کی بھی کوشش کرتا ہے مگر جانتا ہے کہ زمینی حقائق سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔۔۔ لینڈ کرتے ہوئے وہ خودکلامی کے انداز میں خود سے استفہام کرتا ہے کہ آف لوڈ ہونے کے بعد کیا یہ حسینہ مجھے یاد بھی رکھے گی یا نہیں؟۔۔۔ اور یہ کہ آئندہ اگر کبھی میں اس کے گھر کے اُوپر سے پرواز کرتا ہوا نکلا تو کیا یہ مجھے پہچان بھی پائے گی؟۔۔۔ وہ سوچتا ہے اور رنجیدہ ہونے لگتا ہے۔۔۔ لیکن اندوہ کے اس عالم میں اس جہاز کی بابت ذیشان ساحل کہتا ہے کہ اُس کے آنسو نہیں نکل سکتے۔۔۔

''وہ اپنے پروں کو اپنی آنکھوں پر نہیں رکھ سکتا۔۔۔

سائنس کہتی ہے۔۔۔

مشین ہوتا ہے۔۔۔ جہاز محبت نہیں کر سکتا۔۔۔''

سنتا ہے جہاز اور بے قرار ہو کر پھر سے اُڑ جاتا ہے۔''

گلف ایئر کا یہ جہاز مجھے ذیشان ساحل کے اُسی جہاز سے مشابہ دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ بے قرار ہو کر پھر سے اُڑ جانے کے لیے۔۔۔ بالکل تیار!! طارق ہاشمی کے اس شعر:

نو سیاروں سے کچھ آگے
دل اِک دسواں سیارہ ہے

کے مطابق دسویں سیارے کی حدود میں رہ کر پرواز کرنے والا!!۔۔۔ میں دِل ہی دِل میں گلف ایئر کے اس ''شاہین'' کے لیے نیازمندانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے۔۔۔ روانگی کے لیے جہاز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جہاز میں داخل ہوتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے جہاز بھی اپنی بابت میرے غمگسارانہ جذبات سے آگاہی رکھتا ہے۔۔۔ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے رمز آشنا ہو چکے ہیں۔ لمحاتی طور پر مہربان ایک ایسی ایئرہوسٹس کہ جس کی شخصیت پر خالد اقبال یاسر کا یہ شعر:

نظر نظر میں دِلوں کو ٹٹولتی آنکھیں
بلا کا حسن پرانی کہانیوں والا

صادق آتا تھا، کی خوشگوار خیرمقدمی مسکان کا تحفہ وصول کرتے ہوئے، اپنی مخصوص نشست پر براجمان ہو کر میں نے جو سانس لی۔۔۔ وہ صدیوں کا سفر کر کے اپنی منزل پر پہنچنے والوں کا نصیب ہوا کرتی ہے۔۔۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نشست تک پہنچنے کے لیے میں نے صدیوں کا ہی سفر طے کیا تھا۔ میرے پچھلے کچھ دِن وقتاً فوقتاً اسی سرزمین کہ جسے ایشیائے کوچک (Minor Asia) اناطولیہ اور ترکی کا نام دیا جاتا ہے، کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے گزرے تھے۔۔۔ اور مطالعے کی غرض سے بھی میں اس اقلیم میں اس اہتمام سے داخل ہوا تھا کہ دیکھنے والوں نے محمد اظہار الحق کی زبان میں برملا تبصرہ کیا کہ:

چہار آئینہ، سبز گھوڑا، سنہری پٹکا
چلا کوئی دھوم سے اَچھوتے نگر کی جانب

کئی ایام تک دَور بہ دَور، قرن بہ قرن، اس خطۂ زمین کی خاک چھاننے کے بعد جب میں اپنے وقت کی اپنی دُنیا میں واپس آیا تو محسوس ہوا کہ

حیرت سے تک رہے ہیں مجھے لوگ اس طرح
جیسے کہ میں نکالا گیا ہوں خدائی سے
(کاشف نعمانی)

خیر۔۔۔ جونہی میں نے اپنے حافظے سے اپنے اس مطالعاتی دورہ کی حتمی رپورٹ طلب کی تو میرے

خیالاتِ جاریہ نے اپنی گزشتہ دِنوں کی ریاضت کا ثمرہ۔۔۔ بلاچون وچرا اُسی لمحے خوابِ خوانِ سبز پوش پر رکھ کرنہایت احترام سے بارگاہِ تصور میں پیش کردیا۔

ترکی کی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بازنطینی عہد جسے کہ 1299ء سے 1258ء جنم لینے والے عثمان خان کے سلجوقی ترکوں کی حکمرانی ختم کر کے ''قونیہ'' کے مقام پر ''سلطنتِ عثمانیہ'' کی بنیاد رکھنے سے قبل کا عہد گردانا جاتا ہے۔۔۔ جب کہ سلطنتِ عثمانیہ کا پرچم 621 برس تک تین براعظموں کے طول وعرض پر لہراتا رہا۔۔۔ 1918ء میں جنگِ عظیم کے خاتمے پر۔۔۔ جہاں دُنیا کا نیا نقشہ ترتیب پایا، سلطنتِ عثمانیہ بھی زوال پذیر ہوئی اور بالآخر یکم نومبر 1922ء کو مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے۔ سلطنت کے چھتیسویں اور آخری سلطان یا خلیفہ وحیدالدین محمد ششم کو معطل کردیا اور ''خلافت'' کو ''ریپبلک'' میں تبدیل کرتے ہوئے ترکی کو ''ریپبلک آف ترکی'' کا نام دیا۔ گویا 1299ء تا 1922ء کے دورانیے کو ترکی تاریخ کا دوسرا دور قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ 1922ء کے بعد سے آج تک کے دور کو ترکی کا جدید دور خیال کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دِن اچھے موسم کا لطف اُٹھاتے ہوئے خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے سر پر سے بادل کے ایک ٹکڑے کو بن برسے گزرتے دیکھ کر خوش دِلی سے کہا کہ ''تو کہیں بھی چلا جا۔۔۔ برسے گا میری سلطنت کے اندر ہی۔'' اپنے عروج کے زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ کی حدود بھی کچھ اتنی ہی وسیع تھیں کہ ان پر خلیفہ ہارون الرشید کے اِس تاریخی فقرے کا اطلاق کیا جاسکتا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا رقبہ جنوب مشرقی یورپ میں وسطِ بلغاریہ سے مشرقی سربیا حیسیلقان ریجن کہا جاتا ہے تک پھیلا ہوا تھا۔۔۔ اس ساڑھے پانچ لاکھ مربع کلومیٹر رقبے میں یورپ سے البانیہ، بوسنیا، اسربیا، سلاوینیا، ہرزے گووینیا، ہنگری، آسٹریا، بلغاریہ، جزیرہ کریٹ، کریمیا، سائیکلیڈ جزائر، قبرص، ڈوڈیکنس جزائر، اسپورلیس، یونان، مقدونیہ، یورپ سے سارونک، مونٹیگرو، شمالی ایجین جزائر، اٹلی کا علاقہ ''اوٹرینٹو'' موجودہ یوکرائن کا علاقہ پوڈولیا، رہوڈس والشیا، مولداویا، مغربی رومانیہ کا علاقہ ٹرانسلوانیا، اسپوریڈس جزائر شامل تھے۔ براعظم ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے خطے پر نگاہ دوڑائی جائے تو اس خطے سے عدن، آبادان، آرمینیا، آزربائیجان، لبنان، اومان، فلسطین، قطر، حجاز سمیت موجودہ سعودی عرب کا تمام علاقہ، شام اور یمن شامل تھے۔ اسی طرح براعظم افریقہ سے الجزائر، مصر، اریٹیریا، جبل الطارق، لیبیا، صومالی لینڈیلا، مغربی صحارا، ہرگیشیا، بارکو، مراکش، سوڈان اور تیونس سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ نے اس تمام تر علاقے کو انتظامی لحاظ سے 29 صوبوں میں تقسیم کررکھا تھا۔

فکری لحاظ سے جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔۔۔ میرے ساتھ بقول انور شعور:

وقت گو ہمسفر، نہ تھا میرا
وقت کے ہم سفر رہا ہوں میں

کا سا معاملہ درپیش رہا تھا۔ پچھلے چند دِن سے میں سلطنتِ عثمانیہ میں شامل زمینوں اور زمانوں کی مسافت میں اپنے پاؤں شل کرتا چلا آ رہا تھا۔۔۔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو'' کے نتیجے میں رہگذارِ تاریخِ ترکی پر بھاگتے بھاگتے جب یہ مسافت میرے لیے آبلہ پائی بن گئی تو تصور ''زمانے کی دیوار کہنہ'' میں سے ''ہیری پوٹر'' کے جادوئی انداز سے گزر کر لمحہ موجود میں واپس آ گیا۔۔۔ واپس آیا تو میرا شعور مجھ سے فرما رہا تھا۔۔۔ کہ جعفر حسن مبارک صاحب! میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ ترکی کی تاریخ کو بہ حیثیت ایک مسلم اپنا ورثہ خیال کریں اور آپ کو ترکی کی سرزمین پر اپنے ورثے سے ناواقف آدمی کی بے خبری کا احساس لیے پاؤں نہیں دھرنا چاہئیں۔۔۔'' اب جب کہ اپنے شعور کی ہدایت پر میں اپنے ورثے سے آگہی کی دُھن میں اپنا جملہ ذہنی سفر تمام کر کے طیارے کی اس نشست پر ڈھیر ہوا تو، اپنے آپ کو جہاز کی نشست کے حوالے کرنے سے مجھے اپنے پچھلے دِنوں کی تمام تکان۔۔۔ یکسر ہوا ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کو تو گویا ایسا محسوس ہوا، جیسے میری صدیوں پر محیط مسافت یک دم تمام ہوگئی ہو، تاریخ کی یہ مسافت ثمرآور بنانے پر میں نے مقصود وفا کے ان لفظوں میں کہ:

شکریہ ، بے کار جاتی زندگی
ہم کو بھی کچھ کام کرنے آ گئے

اپنی زندگی کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں اپنے ساتھیوں کی نشستوں کا جائزہ لینے کو نگاہ دوڑائی۔۔۔ کوئی اپنی نشست کی مانیٹر اسکرین پر پسندیدہ چینل سیٹ کرنے میں صرف ہو رہا تھا۔۔۔ تو کسی کی نظریں ہوائی میزبان خواتین کے جسمانی نشیب وفراز پر پھسلنے کی تیاری کرتی ہوئی دِکھائی دے رہی تھیں۔۔۔ کوئی Relaxing پوزیشن پر نیم دراز تھا تو کوئی طیارے کی اندرونی فضا سے خود کو ہم آہنگ

کرنے کی کوشش میں مگن تھا۔

ترکی کا ہمارا یہ دورہ کوئی ہنگامی دورہ نہیں تھا اس کا اندازہ ہمارے وفد کے ہمراہیوں کی مجموعی تعداد بیسیوں میں شمار ہونے سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ گویا بقول ناز سرحدی:

؎ موتیا، چمپا کلی، سوسن قطار اندر قطار

والا معاملہ تھا۔ ذاتی حوالے سے دیکھا جائے تو میں بہت عرصے سے سرزمینِ مولانا روم کی خاک اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کا خواہش مند تھا، مگر بات اُسی نکتے پر آن اٹکتی تھی جس کی بابت اکبرالہ آبادی نے فرما رکھا ہے کہ

راہ تو مجھ کو دِکھا دی خضر نے
اُونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

ترکی کے اس سفر کے لیے ''اُونٹ'' کے کرایہ کا بندوبست ہماری جنرل انشورنس کمپنی E.F.U نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔۔۔ لہٰذا پشاور، کوئٹہ، اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور، سرگودھا، ساہیوال اور فیصل آباد سے ہم E.F.U کے ساتھی کرائے نام کی مد کے تفکرات سے بالکل آزاد ہو کر ایک مشترکہ شتر کے سوار تھے۔۔۔

جناب گوہر ہوشیار پوری کے ایک شعر نے سماعت میں اپنی سرسراہٹ شروع کر دی۔

ایک ہجوم عزیزوں کا
ایک بہار ببولوں کی

ہمراہِ سفر قافلے پر میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی تو اسرار احمد، عبدالرزاق، عثمان خاں، شکور پراچہ، عنایت چوہدری، افتخار الدین، سلیم بابر، ارشد عظیم چوہدری، شاہد رضا کاظمی، محمد حمید جیسے احباب کے چہرہ ہائے مہربان نے نورِ بصارت کو دوچند کر دیا۔۔۔ اب سوچتا ہوں کہ اُس وقت۔۔۔ نورِ بصارت کو دوچند کرنے میں شاید تھوڑا بہت کمال اس محترمہ کا بھی ہو جسے گلف ایئر نے طیارے کی فضائی میزبانی کے منصب پر فائز کر رکھا تھا اور جسے کہ میں بھی اپنے دیگر ہم سفروں کی پیروی میں اثر لکھنوی کے مطابق:

اِدھر دیکھ لینا ، اُدھر دیکھ لینا
پھر اُن کی طرف اِک نظر دیکھ لینا

کی تہذیبی چالاکی سے جسے ''شائستگی'' کا نام بھی دیا جا سکتا ہے خراجِ حسن پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لے رہا تھا۔۔۔ سیر و سیاحت کی حوالہ سے میں کم سے کم احباب کی ہمسفری کو ترجیح دیتا آیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاحتی وفد کی تعداد از حد زیادہ ہو جانے کی وجہ سے۔۔۔ ہر فرد اپنے آپ کو وقت دینے سے معذور ہو جاتا ہے۔۔۔ جیسا کہ جمال احسانی کا تجربہ بتاتا ہے:

بہت دوسروں کو بہم آیا میں
مگر اپنے حصے میں کم آیا میں

مجھے ڈر تھا کہ اتنے بڑے سیاحتی وفد میں شمولیت کی بدولت کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو بہم آنے کی کوشش میں، مَیں خود کو دستیابی سے محروم ہو جاؤں۔ گویا سفر پر روانگی سے قبل ہی میں اتنا جان چکا تھا کہ میرے اس سفر کی لطف یابی کا اِنحصار اس اَمر پر ہوگا کہ وفد میں شامل مہ و نجوم کی روشنی مجھے کس حد تک بہم پہنچتی ہے۔ قافلہ رواں ہوا تو جلد ہی مجھ پر اپنی پوزیشن بھی واضح ہوگئی۔۔۔ بقول افضال نوید:

مہر و نجوم و ماہ، غبارِ سفر میں تھے
دیکھا تو اِس ہجوم کے پیچھے کہیں تھا میں

میں اس مسافت پر تقریباً گزشتہ چوبیس گھنٹے سے نکلا ہوا تھا۔۔۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ میرے برادرِ خورد غضنفر نے مجھے گزشتہ کل تقریباً اسی وقت فیصل آباد سے وداع کیا تھا۔۔۔ فیصل آباد سے، اسلام آباد تک کے سفر کی تکان میں سے اسلام آباد میں کچھ دیرینہ احباب سے ملاقات کی ''تازگی'' کو منہا کرنے کے باوجود ہلکا اضمحلال باقی بچ رہا تھا اور اس پر مستزاد کہ تھوڑے بہت آرام کی غرض سے اسلام آباد ہی کے ایک مقامی ہوٹل میں جو کمرہ لیا گیا تھا وہ اپنے مقاصد پورے کرنے سے قاصر رہا تھا۔ گویا بے آرامی کے چوبیس گھنٹے۔۔۔ گزارنے کے بعد طبیعت کو کچھ کچھ قرار آنے کے آثار دِکھائی دینے لگے تھے۔۔۔ اس سے قبل فیصل آباد سے اسلام آباد کی مسافت میرے لیے کبھی اس قدر ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کا باعث نہیں بنی تھی۔ اسلام آباد کا سبزہ، فرحت بخش ہوا، پُرسکون ماحول ہمیشہ گرانی طبع کا معالج ثابت ہوتا رہا تھا۔ مگر اس بار کا میرا تجربہ بہت مختلف ثابت ہوا۔۔۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں اسلام آباد میں ہنگامی طور پر بلاوے کے نتیجے میں۔۔۔ بہت سے ضروری کام ادھورے چھوڑ کر چل پڑا تھا۔۔۔ حالانکہ یہ بلاوہ قبل ازیں طے شدہ پروگرام کا نتیجہ تھا جسے میری تساہل پسندی نے بالآخر میرے لیے ہنگامی بنا کر رکھ دیا، اور اس وجہ سے میں اپنی وہ بہت سی ''اپائنٹ منٹس'' کہ جو خود میرے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ ''آنر'' نہیں کر سکا تھا۔۔۔ اور جس جس جگہ جانا طے شدہ تھا، میں نہیں پہنچ پایا تھا، بقول اکرام مجید:

اور ہی کہیں ٹھہرے ،اور ہی کہیں پہنچے
جس جگہ پہنچنا تھا ہم وہاں نہیں پہنچے

میرے تصور میں اپنے مثال پبلشرز کے بے مثال دوست محمد عابد کا ناگواری سے مسخ ہوتا ہوا چہرہ بار بار اپنے نقوش واضح اور دُھندلا کرنے کا کھیل کھیل رہا تھا۔۔۔ برادرم محمد عابد سے طے ہوا تھا کہ گزشتہ دن دس بجے ہم جی۔سی۔ یونیورسٹی فیصل آباد کے ڈین جناب ڈاکٹر انوار احمد سے ملیں گے۔ ڈاکٹر انوار احمد صاحب پیشہ ورانہ طور پر انقرہ یونیورسٹی سے منسلک رہ چکے ہیں اور تقریباً عرصہ چار سال تک آپ کا قیام ترکی میں رہا ہے۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے دورۂ ترکی کی بہ نسبت اُن کی ذاتِ گرامی سے افادہ حاصل کروں۔۔۔ اُن کے ایک زیرِطبع خاکے۔۔۔ ''آسمان بیلن کے لیے زمین زاد کے چند محبت بھرے حروف'' میں، میں آسمان بیلن جو انقرہ یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب کی استاد ہیں اور ان کے شوہر امین اوزبان جو انقرہ یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان کے استاد ہیں کا تذکرہ پڑھ چکا تھا اور پچھلے طویل عرصے سے ترکی ہی میں مقیم ڈاکٹر اے۔ بی اشرف جیسے اُردو دان ''ملتانی ترک'' جن کا ذکر ڈاکٹر انوار احمد کے قریبی حلقۂ احباب میں کیا جاتا ہے، کے حوالے سے خاص طور پر ملنے کی چاہ رکھتا تھا۔۔۔ مجھے توقع تھی کہ محمد عابد نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے گوش گزار کر رکھا ہوگا کہ جعفر حسن مبارک ترکی میں اُردو زبان و ادب کی صورتِ حال کے حوالہ سے بعض ایسے سوالات رکھتا ہے جن کے جوابات کی روشنی میں اس کا دورہ ترکی مطالعاتی حوالے سے اس کے لیے کہیں زیادہ بار آور ہوسکتا ہے۔ عابد نے کمال مہربانی سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کروانے کے لیے اپنے چند انتہائی ضروری امور موقوف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ''ڈیووٹ'' کر رکھا تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

مزید برآں سماجی میدان کے بہت سے معاملات میں مجھے اسسٹ کرنے والے۔۔۔ ایم اے زاہد کے ذمہ میں نے کچھ ''اسائن منٹس'' لگا رکھی تھیں۔ ان کے بارے میں بات کرنے کے لیے اُس سے ملاقات ضروری تھی۔ اس کے علاوہ مجھے فیصل آباد کی معروف علم پرور شخصیت فادر آفتاب جیمز سے بالمشافہ مل کر اپنے سفرنامہ دُبئی ''دریا سے صحرا تک'' کی تقریب پذیرائی جو کہ بشپ ہاؤس فیصل آباد میں ہونا قرار پائی تھی کے التوا کے لیے درخواست گزار ہونا تھا، مگر میں متذکرہ دونوں احباب سے ملاقات نہ کر پایا تھا۔

پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ساعت پر دھیان دیا تو معلوم ہوا کہ طیارے میں متعلقہ عملے کی طرف سے معمول کے خیر مقدمی کلمات کہے جا رہے ہیں۔۔۔ معمول کی ہدایات کے بعد سوفٹ اینڈ ہارڈ ڈرنکس سے مسافروں کی تواضع کے اہتمام کا آغاز کر دیا گیا۔۔۔ بہت سے زاہدانِ پاکباز اپنے بعض عاصی ہمسفروں کا یہ مشورہ کہ

یہ مے کدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

قبول کرتے ہوئے احتراز کو خیرباد فرما چکے تھے۔۔۔ بیئر۔۔۔ وہسکی۔۔۔ واڈکا۔۔۔ جن۔۔۔ اسکاچ۔۔۔ برانڈی وغیرہ ایسی نعمتوں کے دستیاب ہوتے ہوئے بھی ہم ایسے لوگ جو کفرانِ نعمت کے ارتکاب کو اپنے زعم پارسائی کا ذریعہ بناتے ہیں اپنی اپنی پسند کے مطابق مختلف جوسز سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس دوران میں طیارہ اپنے آپ کو سفید بادلوں سے اُوپر اُٹھا چکا تھا۔۔۔

میں عملے کی طرف سے معلوماتی ''اعلانات'' جن میں بتایا جا رہا تھا۔۔۔ کہ طیارہ اس وقت کتنی بلندی، کس رُخ اور کتنی رفتار پر محوِ پرواز ہے کو قابل اعتنا جانے بغیر اپنے اردگرد رُونما پذیر ہونے والی مسافرانہ نشست و برخاست کا مشاہدہ کرنے کی طرف متوجہ تھا۔

نشست کے حوالہ سے مجھے ایک بحرینی عرب کی ہمسائیگی کا شرف حاصل ہوا تھا۔۔۔ تعارفی مکالمے میں اس نے اپنا نام احمد بتایا تھا۔۔۔ سمجھنے کی حد تک روزمرہ کی اُردو بخوبی سمجھتا تھا مگر بولنے میں توڑ پھوڑ کیے بغیر کام نہیں چلا سکتا تھا۔۔۔ میں اُس سے مکالمے کی خواہش رکھتا تھا مگر۔۔۔ اُس نے میری طرف سے کی گئی تعارفی کوشش کو اپنا نام بتانے سے علاوہ زیادہ پذیرائی کے قابل نہ سمجھا تھا۔ مزید برآں اپنے آپ کو ''بیزار'' پوز کر کے میرے اور اپنے درمیان وہی خلیج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو خلیجی ممالک اور ایشیا کے درمیان جغرافیائی طور پر موجود ہے۔۔۔ مجھے بھی اُس سے کوئی ایسا سروکار نہ تھا۔۔۔ ایک تو محض اپنی پاکستانی عادت کی تسکین کے لیے اس کے ساتھ یونہی ''گپ شپ'' میں کچھ وقت بتانے کی خواہش پر اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ دوسرا جیسا کہ سعدیہ قریشی کا بیان ہے:

محبتوں کے سفر میں ہم ایسے لوگوں کو
بس ایک لمحۂ خوش باریاب کافی ہے

اپنے ہمسفر کے حوالہ سے ایک لمحۂ خوش باریاب کا حصول مرے پیشِ نگاہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھی اُس کی طرح ''بیزار'' ہو جاتا اُسے غالباً اپنی بے جا بے رُخی کا احساس ہوگیا۔۔۔ لہٰذا اس نے معذرت

خواہانہ انداز میں اس وضاحت کو غیر ضروری نہیں جانا کہ سفر میں وہ کسی ہمسفر سے گفتگو کی بجائے کتاب کے مطالعے کو زیادہ ترجیح دیتا ہے اور دورانِ سفر اپنے اس شغل میں کسی کی مداخلت اُسے غیر آسودہ کر دیتی ہے۔۔۔ بعدازاں اُس نے اپنے بیگ سے کتابی سائز اور کتابی طرز کا ایک مانیٹر نکالا، جس کی لوح جبیں پر ''سونی ریڈر'' لکھا ہوا تھا۔۔۔ اور کھول کر مطالعہ شروع کر دیا۔ اپنے دیگر پاکستانی ہمسفروں کی طرح مجھے بھی چاہیے تھا کہ اپنی سیٹ کے ساتھ آراستہ ہیڈ فون سر پر چڑھاتا۔ سامنے کا مانیٹر آن کر کے ''مووی'' وغیرہ دیکھ کر دل پشوری یا لہوری کرنے میں مگن ہو جاتا۔۔۔ مگر اپنے ہمسفر احمد کی اس ڈیجیٹل بک (Digital Book) نے ڈیجیٹل بک کے بارے میں جاننے کے میرے اشتیاق میں اضافہ کر دیا تھا۔ موجودہ صدی کے گزشتہ عشرے میں کمپیوٹر کی تیز رفتار ترقی نے دفتری معاملات کو بڑی حد تک ''پیپر فری'' کر دیا ہے۔ جدید دفتری نظام میں پیپر کی اب وہ اہمیت یا ضرورت باقی نہیں رہی کہ جو حساب کتاب کی کمپوزیشن کے لیے کسی زمانے میں درکار ہوا کرتی تھی۔۔۔ اس کے باوجود کچھ عرصہ پہلے تک یہ خیال عام تھا۔۔۔ کہ کمپیوٹر جتنی بھی ترقی کر لے کتاب کی جگہ نہ لے سکے گا کیونکہ انسانی بصارت کمپیوٹر پر طویل عبارات پڑھنے کی متحمل نہ ہو پائے گی۔ مگر احمد کو عام پیپر بک کی طرح نہایت سہولت سے یہ ڈیجیٹل بک پڑھتے ہوئے دیکھ کر اس خیال کا قائل ہوتا جا رہا تھا کہ آئندہ سالانہ دہائی ہمیں پیپر بک سے مکمل طور پر بے نیاز کر دے گی۔۔۔

پندرہ بیس منٹ غرقِ مطالعہ رہنے کے بعد احمد صاحب نے اپنی ڈیجیٹل بک آف کر دی اور پھر میری جانب متوجہ ہوئے۔۔۔ اس مرتبہ سلسلۂ کلام کا آغاز انھی کی جانب سے ہوا۔۔۔ ''آپ کس پروفیشن سے وابستہ ہیں؟''

میں نے انھیں E.F.U جنرل انشورنس کا حوالہ دیا۔۔۔ تو بولے ''مسٹر جعفر میں دُنیا کے جن پروفیشنلز کا بہت احترام کرتا ہوں وہ بیمہ ایجنٹس ہیں۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ بیمہ ایجنٹ حالات میں بہتری کے تواتر کا سب سے بڑا خواہش مند ہوتا ہے۔۔۔''

میرے اس سوال پر کہ ''کیا آپ پاکستان کے سیاحتی دورے سے واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔۔۔'' جواباً انھوں نے ایک قہقہہ میری جانب اُچھال دیا۔۔۔ اور ساتھ ہی گویا ہوئے۔۔۔

''مسٹر جعفر لگتا ہے پاکستان میں رہنے کے باوجود آپ کو پاکستان کے حالات سے کچھ زیادہ آگہی حاصل نہیں ہے؟''

میں نے کہا ''آپ وضاحت فرمائیے کہ آپ ایسا، کس تناظر میں فرما رہے ہیں؟''

بولے ''آپ نے پاکستان کے جو حالات بنا رکھے ہیں اُن کے پیشِ نظر کوئی غیر ملکی اگر پاکستان آئے گا بھی تو میرے خیال میں کسی مجبوری کے تحت ہی آئے گا۔۔۔ سیاحتی، تفریحی یا مطالعاتی دورے پر نہیں آئے گا اور چھٹیاں گزارنے تو ہرگز نہیں آئے گا۔۔۔ اغوا، لوٹ مار۔۔۔ قتل و غارت، احتجاج، جلسے جلوس، دھماکے۔۔۔ خودکش حملے۔۔۔ میں تو حیران ہوں کہ یہاں کیا کیا کچھ نہیں ہو رہا۔۔۔ ایسے میں سیاحت کے لیے یہاں کون آنے لگا؟''

جیسا کہ کامی شاہ نے کہا ہے:

چاہتا ہوں کہ تھوک دوں خود کو
اتنی شدت سے بھر گیا ہوں میں

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ احمد اتنی شدت سے بھرا بیٹھا ہوگا۔

''تو پھر آپ کا کس سلسلہ میں پاکستان آنا ہوا؟''

ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔۔۔ ''مجبوری۔۔۔ کچھ سال پہلے مجھے لگا شاید حالات بہتر ہونے جا رہے ہیں۔۔۔ میں نے ساکس میں کچھ پیسہ لگایا۔۔۔ فارماسوٹیکل انڈسٹری میں کچھ انویسٹمنٹ کرنے کا ارادہ بنایا تھا۔۔۔ خیال تھا کہ پاکستان کو جو لائف سیونگ ادویات امپورٹ کرنی پڑتی ہیں کم لاگت پر اُن کی تیاری کا کام یہیں سرانجام دیئے جانے کا اہتمام کیا جائے۔ مگر افسوس کہ یہ سب میری خواہش کے مطابق نہ ہو سکا۔۔۔ آج کے حالات میں سوچتا ہوں کہ میرا یہاں انویسمنٹ کرنے کا فیصلہ شاید درست نہ تھا۔ سو میرا، اِدھر بزنس کے معاملات سمیٹنے کے سلسلہ میں آنا ہوا تھا۔

احمد کی زبان سے یہ سب سن کر بطور پاکستانی میرا مایوس ہونا فطری اُمر تھا۔ پھر بھی میں نے پاکستانی صورتِ حال کے حوالہ سے اس کی رائے استوار کرنے کے لیے ایک کوشش کر لینے میں حرج خیال نہیں کیا اور کہا ''مسٹر احمد کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ پاکستانی صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک کرنے میں کچھ زیادہ حساسیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟۔۔۔ اور یہ کہ، یہ صورتِ حال۔۔۔ وقتی ہے۔۔۔ کچھ عرصے بعد سب کچھ معمول پر آ جائے گا۔''

اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔۔۔ بولا ’’بھائی۔۔۔اس وقت جو خاک یہاں ہر طرف اُڑائی جا رہی ہے۔آپ ہی بتائیں آپ کو اس میں اپنے مستقبل کا کونسا خوش کُن منظر دِکھائی دے رہا ہے۔۔۔ ہر محاذ پر شور اِتنا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔۔۔ عجیب معاشرہ ہے کہ ہر بندہ بیمار ہے اور ہر بندہ ڈاکٹر۔اس شور میں کسی کو اگر کوئی سمفنی (Simfny) سنائی دے رہی ہے تو پھر اُسے کوئی پاکستانی ہی سن سکتا ہو گا۔۔ میں تو سچی بات ہے بہت مایوس ہوا ہوں۔۔۔آپ اس بات کا برا نہ مانیے گا۔۔۔‘‘

غلام محمد قاصر نے کہا ہے:

غم کی تشریح بہت مشکل تھی
اپنی تصویر دِکھا دی ہم نے

احمد صاحب نے اپنے غم کی تشریح کے لیے اپنی تصویر کی بجائے پاکستان کی تصویر میرے سامنے رکھ دی تھی۔

اس نے گفتگو اپنی روانی میں جاری رکھی۔۔۔

’’مجھے تو قریب سے دیکھنے پر آپ کی سوسائٹی بہت عجیب سی لگی۔۔۔ یہاں ہر بندہ اندھیرا دُور کرنا چاہتا ہے مگر دوسرے کی موم بتی جلا کر۔یہاں جو شخص ایک مرتبہ حفظانِ صحت کا کتابچہ پڑھ لے، ڈاکٹر بن بیٹھتا ہے۔۔۔سب سے زیادہ پیٹ بھرنے والا اپنے پیٹ پر سب سے بڑا پتھر باندھے پھرنے کا دعویدار ہے۔ ہر آدمی یہاں عدل کا نظام چاہتا ہے، مگر اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے۔۔۔جمہوریت کے نام پر اتنا انتشار۔۔۔اِتنا انتشار۔۔۔مذہب کے نام پر ایسے ایسے تفرقات۔۔۔ سیاست کے نام پر ایسی ایسی عداوتیں۔۔۔ الاماں۔۔۔ مجھے انڈیا جانے کا بھی اتفاق ہوتا رہتا ہے۔۔۔وہاں بے شمار نسلی، مذہبی ،لسانی تضادات ہیں بلکہ یوں کہیں کہ تعصبات ان کی جبلت میں داخل ہیں تو بے جا نہ ہو گا اس کے باوجود۔۔۔ اداروں کی سطح پر ان کا نظم وضبط۔۔۔ پالیسیوں کا تسلسل۔۔۔ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشت۔۔۔کیا کبھی آپ لوگوں نے سوچا ہے کہ آپ اپنے اس حریفِ دیرینہ کے مقابلے میں کہاں کھڑے ہیں؟ اسی روایتی ڈاکٹرائن کے مطابق جس میں یہود وہنود کی سازشیں۔۔۔ آمریت۔۔۔ امریکی مداخلت کو اپنے مسائل کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، میں نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تو اس نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔۔۔اُس نے کہا تمہارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگ ایک منزل کی تعمیر کے لیے بنیاد بناتے ہو مگر بعد میں اس پر چار منزلوں کا بار ڈال دیتے ہو نتیجتاً تمام عمارت زمین پر آ رہتی ہے۔۔۔اور تم پھر نئے سرے سے ایک منزل کی تعمیر کے لیے بنیاد رکھنا شروع کر دیتے ہو۔۔۔تمہارا انفراسٹرکچر اگر کوئی ہے تو قابلِ بھروسہ نہیں ہے۔۔۔تمہارے ادارے اگر کوئی ہیں تو تباہ حال ہیں۔۔۔نہ کسی کام میں کوئی پلاننگ ہے نہ استقامت ہے۔۔۔ نہ کام تم خود کرتے ہو نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے ہو تمہارا صرف ایک ادارہ فعال منظم اور مضبوط ہے۔۔۔وہ ہے آرمی۔۔۔اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنی تمامتر جمہوریت پسندی کے باوجود اپنی اب تک کی بقا کے لیے اس ادارے کا مشکور ہونا چاہیے۔۔۔مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ اب اس ادارے کو بھی تباہ کرنے پر تلے بیٹھے ہو۔۔۔ خدا آپ پر رحم کرے۔۔۔‘‘احمد صاحب گفتگو کیا کر رہے تھے:

؎ ایک نشتر تھا کہ جو دِل میں چبھویا جا رہا تھا

مجھے معلوم تھا کہ احمد پاکستان کی اندرونی صورتِ حال کے حوالہ سے کسی مغالطے کا شکار نہیں ہے،اس کے باوجود اس کا طنزیہ اندازِ گفتگو مجھے ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔اس نے میرے اعصاب کو تناؤ میں مبتلا کر رکھا تھا۔۔۔ اصولی طور پر مجھے تسلیم ہے کہ حقائق کو کھلے دِل سے تسلیم کیا جانا چاہیے مگر کیا کیا جائے کہ ہم پاکستانیوں کی تربیت ہی کچھ ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ ہم حقائق کو عموماً ناگواری ہی سے قبول کرتے پائے جاتے ہیں۔۔۔

احمد نے بھی بعد ازاں مجھ کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر۔۔۔اپنی ڈیجیٹل بک دوبارہ آن کر لی۔

سفر کے آغاز میں طبع ایک دفعہ اس وقت کرکری ہوئی تھی کہ جب بورڈنگ سے قبل F.I.A والوں کی جانب سے ہمارے وفد کے ایک سینئر ممبر افتخار الدین کو روک لیا گیا تھا۔۔۔اُن پر اعتراض یہ تھا کہ وہ چونکہ اپنی فیملی کے ساتھ ترکی جا رہے ہیں اس لیے ان کے ویزے کنفرم یا ویری فائی کیے جانے کی ضرورت ہے۔۔۔ بعد ازاں اگرچہ ان لوگوں نے اپنے اعتراضات کمال مہربانی سے واپس لے لیے مگر ہم سب کے لیے F.I.A عملہ کے اس سراسر ناجائز طرزِ عمل نے بدمزگی پیدا کر دی تھی۔۔۔اُسی بدمزگی کا اثر جو اس وقت میں نے F.I.A والوں کے حُسنِ سلوک کی بدولت طبیعت پر محسوس کیا تھا۔احمد سے مکالمے کے بعد پھر سے خون میں رواں ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔۔۔سفر کی ایسی شروعات کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔خوش قسمتی سے میری توجہ کو اتفاقاً ایک نیا تماشہ میسر آ گیا تھا۔۔۔میرے قریب ہی کی سیٹ پر

ہمارے ایک دوست جو گہرے شیشوں کی عینک سے معنک تھے۔۔۔بظاہر آنکھیں بند کیے سوئے ہوئے تھے مگر ان کی عینک کے شیشوں کو ایک خاتون فضائی میزبان کے وجود کا عکس اس قدر بھا گیا تھا کہ۔۔۔ جدھر جدھر بھی وہ خاتون رُخ کرتی۔۔۔عینک کا رُخ بھی غیر محسوس طور پر اُدھر ہی کو ہو جاتا۔۔۔یوں دکھائی دیتا تھا جیسے بقول حفیظ ہوشیار پوری:

ے یوں دیکھنا کہ ٹوٹے نہ رشتہ نگاہ کا
اِک بار دیکھنے میں وہ سو بار دیکھنا

کا عملیہ زیرِ عمل لایا جا رہا ہو، مجھے یقین تھا کہ عینک ان کی نیند میں بند آنکھوں کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی اس ''اَن تھک'' نظربازی کا مظاہرہ کیے چلی جا رہی ہے۔۔۔ضرورت اس اَمر کی تھی کہ نیند سے جگا کر موصوف کو نظربازی میں براہِ راست آنکھیں اِستعمال کیے جانے کی افادیت سے آگاہ کیا جائے۔۔۔مرزا غالب کے اس فرمان کے پیشِ نظر کہ

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشہ غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

چاہیے تو یہ تھا کہ اُن موصوف کی چشمِ تماشہ بھی اپنی عینک کے ذوقِ تماشا کا ساتھ دیتی مگر وہ ''وا'' نہ ہو کر ایک طرح سے ''فعلِ غافلانہ'' کا ارتکاب کر رہی تھی۔۔۔مگر مشکل یہ تھی کہ میرے نزدیک کسی کے ''افعالِ چشمیہ'' میں مداخلت کوئی ایسا قابلِ تحسین عمل نہ تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں خود کو ''دیکھنے والوں کی نظر دیکھتے رہنے'' تک محدود رکھوں۔۔۔ یوں بھی جگر مرادآبادی صاحب کہہ گزرے ہیں:

حُسن جس حال میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دِل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ہمارے ''ٹور گائیڈ'' (Toor Guide) بلکہ جنھیں ''ٹور آپریٹر'' کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ عابد۔۔۔ وفد کے جملہ ممبران کی سفری ڈاکومینٹیشن کے انتظامات جن کے ذمہ تھے۔ قربِ منزل کی اناؤنس منٹ۔۔۔ کے ساتھ ہی جہاز چھوڑنے کی تیاری کر چکے تھے۔۔۔ جہاز رَن وے پر اپنے قیام کی دوڑ تمام کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ عابد صاحب اپنی سیٹ چھوڑ کر سامان سمیٹتے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔ چار سوا چار گھنٹے کی فلائٹ اپنے اختتامی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ماہ جولائی میں۔۔۔بحرین کے درجہ حرارت کا اعلان نہ بھی کیا جاتا۔۔۔تو بھی اس کی شدت کا ہر مسافر کو اندازہ تھا تاہم ٹائم کی درستگی کے لیے T.V مانیٹرز پر ٹائم کا اعلان بہت سے مسافروں کے لیے مفید ثابت ہوا۔۔۔ ہم ایسے ''ٹرانزٹ'' مسافروں کے لیے کہ جنھیں بحرین انٹرنیشنل ایئرپورٹ لاؤنج میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کے بعد ایک کنیکٹنگ (Connecting) فلائٹ سے استنبول کے لیے اُڑان بھر جانا تھی۔۔۔ وقت کی درستگی کے لیے ''گھڑیوں'' اور ''فون سیٹز'' کو زحمت دینے کی ایسی اشد ضرورت نہ تھی۔۔۔گلف ایئر نے اپنے مسافروں کے لیے خدمات کے جس اعلیٰ معیار کا تعین کر رکھا ہے۔۔۔ اس طیارے کا عملہ اس معیار کی تصدیق کرنے میں کامیاب رہا تھا۔۔۔طیارہ رُکا تو میرا نشستی ہمسایہ احمد بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس لمحے مجھے ضرب المثل ہو جانے والے مصرع

ع نشستند و گفتند و برخاستند

کا اس صورتِ حال پر اطلاق بہت برمحل محسوس ہوا۔ احمد نے بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ الوداعی مصافحہ کیا۔۔۔ اور بحرین میں قیام کی رسمی دعوت دی۔۔۔مگر میں نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ''اگر کبھی بحرین آنا ہُوا تو'' کی شرط پر رسماً اس کی دعوت قبول کر لی۔۔۔ نہ جانے مسافرت میں کیا رومان ہوتا ہے کہ اس میں مختصر وقت کا ساتھ ہی کیوں نہ ہو ایک دوسرے سے بچھڑے وقت۔۔۔ ملال اور اُداسی کی کیفیت گھیراؤ کر لیتی ہے۔۔۔ جاتے وقت ''احمد'' نے اپنا بزنس کارڈ عنایت کیا۔۔۔اور جاتے ہوئے معذرت کی کہ اگر اُس کے خیالات سے مجھے کوئی دُکھ پہنچا ہو تو اُسے معاف کر دیا جائے اور یہ کہ وہ ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو اُمید بھری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لیے پاکستان کی معاشی و سماجی پسماندگی اس کے لیے تشویش کا باعث ہے۔۔۔ میں احمد کے جذبات سمجھ رہا تھا مگر اجتماعی حوالے سے بطور قوم اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری انفرادی سطح پر قبول کر لینے کے لیے میری طرح شاید کوئی بھی پاکستانی تیار نہ ہو۔ احمد کو رُخصت کرنے کے بعد میں نے بھی اپنا چھوٹا سا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور قنبر حمید کہ جو اپنے دیگر اہلِ خانہ کے ساتھ ایگزٹ ڈور کی جانب رواں تھے۔۔۔ کے ساتھ ہو لیا۔ طیارے کے خارجی در کی طرف پیش گامی کرتے ہوئے اُن کی خوش گامی بتا رہی تھی کہ انھوں نے دورانِ پرواز بہت حد تک نیند پوری کر لی ہے۔ میرے دائیں ہاتھ محمود علی تھے جو چلتے ہوئے مجھے کچھ کچھ مشکل میں محسوس ہو رہے تھے۔۔۔اُن کی مشکل ایک جستی باکس (Box) تھا جسے عرفِ عام میں ٹرنک کہا جاتا ہے۔ میں نے لپک کر اُن کی مدد کرنی چاہی۔۔۔ میں حیران تھا کہ اس عالی دماغ شخص نے اپنا یہ بھاری بھر کم ٹرنک کیری کیوں کر رکھا ہے۔

’’بک‘‘ کیوں نہیں کروایا۔۔۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس باکس کی وساطت سے انگریزی ترجمے پر مشتمل قرآنی نسخہ جات ترکی لے جائے جارہے ہیں۔ تاکہ وہاں مقامی اہلِ حق کو ہدیہ کیے جاسکیں اور کیری کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ۔۔۔ اگر یہ باکس دوسرے سامان کے ساتھ ’’بک‘‘ کروادیا جاتا تو اس عمل سے کلامِ ربی کے تکریمی تقاضے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔۔۔ میں جانتا تھا کہ محمود علی یہ باکس اُٹھانے میں کسی دوسرے کی مدد قبول نہیں کریں گے کیونکہ وہ اس سعادت کے حصول سے لحاظی طور پر بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ ہوں گے کہ جو وہ برابر حاصل کیے جا رہے تھے۔۔۔ سو میں نے بہتر جانا کہ مدد کے نام پر انھیں ان کی سعادت سے محروم کردینے سے گریز کرنا چاہیے۔۔۔ ایگزٹ ڈور پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بحرین انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر بحرین کا نہایت روشن سورج اپنی تیکھی دھوپ کے ساتھ۔۔۔ گرم مرطوب ہوا کہ تندوتیز جھونکوں میں ہمارے استقبال پر مامور ہے۔۔۔ طیارے کے قریب ہی پیسنجرز کو لاؤنج تک پہنچانے کے لیے ایک بس موجود تھی۔۔۔ جس پر سوار ہونے کے لیے بابر شیخ، رزاق جوہری، راس مسعود، اے۔آر ریاض، اظہارالحسن چشتی اور طیب گردیزی۔۔۔ ہم ایسے دیگر رہروانِ خستہ پا سے بازی لے جاچکے تھے۔۔۔ رَن وے سے ایئرپورٹ بلڈنگ تک کی مسافت طے کرنے کے بعد لاؤنج تک پہنچنے کے لیے۔۔۔ ایک ایکسلریٹر ہماری مددگار ہوئی۔۔۔ استنبول کے لیے یہاں سے ہماری کنیکٹنگ فلائٹ کم ازکم تین ساڑھے تین گھنٹے کی دُوری پر تھی۔

ٹرانزٹ پیسنجر کے طور پر لاؤنج میں وقت گزارنے کے یے ایک طرف نماز کے لیے مختص کیا گیا ایریا موجود تھا تو دوسری طرف مختلف النوع ڈیوٹی فری شاپس پر مختلف ممالک سے امپورٹ شدہ الکحلک ڈرنکس بھی موجود تھیں۔ ایک شاپ پر موجود انگور کی بیٹی کو میری ہیئت کذائی پر غالباً پیشگی اندازہ ہوچکا تھا کہ میں غلط ترجیحات قائم کرنے والی قوم کا چشم و چراغ ہوں۔ اس لیے جب میں نے اُس عفیفہ پر ’’سیون اَپ‘‘ کو ترجیح دیتے ہوئے شاپ کے سامنے نصب ایک بیوریج وینڈنگ مشین سے بیوریج ٹن پیک حاصل کیا تو مجھے اندازہ تھا کہ اُسے میری اس حرکت پر چنداں افسوس نہیں ہوا ہوگا۔۔۔ شاپ کیپر فلپائنی خاتون (یا شاید لڑکی) کا البتہ میں ضرور مشکور تھا جس نے مجھے بیوریج وینڈنگ مشین استعمال کرنے کے لیے سکّے فراہم کردیئے تھے۔۔۔ سیون اپ ٹن پیک سے رازونیاز کے لیے میں نے دانستہ طور پر لاؤنج کی ایک ایسی نشست کا انتخاب کیا جس پر بیٹھ کر حفاظت کردار کے نقطۂ نظر سے عشوہ وناز وادا کے بل بوتے پر مرد حضرات کو بہکانے والی چالباز بیبیوں پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔۔۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد شیطان کے بہکاوے میں آکر میں نے تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھیں۔۔۔ اپنے آپ کو ماحول کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔۔۔ اور اپنا سیل فون کہ جو دورانِ سفر آف تھا۔۔۔ آن کرکے اس کی رفاقت میں چلا گیا۔ سیل فون آن کیا ہی تھا۔۔۔ SMS پیغامات کی باقاعدہ قطار میں آمد شروع ہوگئی۔۔۔ پیام رسانی کے لیے میں عادتاً بہت کم SMS پر انحصار کرتا ہوں مگر میرے احباب میں چند ستم ظریف چٹکلہ ساز ایسے ہیں کہ جو ’’لطائفِ خبیثہ‘‘ ارسال فرما کر دادطلب ہونے میں بہت مسرت محسوس کرتے ہیں۔

SMS وصول پانے اور اُن میں سے چند ایک ’’صدقۂ جاریہ‘‘ کے طور پر فارورڈ کرنے کے بعد میں پھر اردگرد پھیلے مختلف النسل مسافروں کو اپنے اپنے معمولات میں مشغول اپنی اپنی منزل کی طرف روانگی میں کوشاں دیکھنے میں مگن ہوگیا۔۔۔ انھی مسافروں میں معروف پاکستانی قوال شیرعلی، مہرعلی اپنے ہم نواؤں کے ساتھ سفید شلواروں، بوسکی کی قمیضوں میں ملبوس چند منٹ کی جھلک دکھانے کے بعد پردۂ سیمیں پر چلتی ہوئی پکچر سے مہمان اداکار کی طرح غائب ہوچکے تھے۔ سفر کے حوالے سے میرا تجربہ ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم اور ایئرپورٹ لاؤنج میرے لیے ہرگز بیزاری یا بوریت کا باعث نہیں بنتا بلکہ یہ مقامات میرے لیے۔۔۔ باڈی لینگوئج سے لکھی گئی انسانی کتابوں کی مطالعہ گاہ کا درجہ اختیار کرجاتے ہیں۔ میں چہروں پر سجے مکھوٹوں۔۔۔ مکھوٹوں کے پیچھے چھپے چہروں کے خدوخال کا اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا ہوں۔۔۔ لوگوں کو کردار میں ڈھال کر افسانوں اور کہانیوں کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔۔۔ ایسے مقامات پر میرا وقت پر لگا کر اُڑنے لگتا ہے۔۔۔ وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔۔۔ تین سوا تین گھنٹے۔۔۔ فلائٹ کے انتظار میں بیٹھنے کے لیے ایسا کم وقت بھی نہیں تھا، مگر پتہ ہی نہیں چلا کہ کب گزر گیا۔۔۔

ساتھیوں کو یکجا کرنے کے لیے آوازہ لگایا جارہا تھا۔۔۔ ایک چھوٹا جہاز استنبول کی پرواز کے لیے ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار تھا۔۔۔ اس وقت میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اب کی بار بورڈنگ کے

مراحل میں ''جامہ تلاشی'' کی ذلت شامل نہیں تھی۔''سکیننگ ڈور'' سے گزر کر قطار کی صورت میں اپنی نئی سواری کی طرف روانگی شروع ہوگئی۔ یہ جہاز اپنی سہولیات کے حوالے سے ایسا آرام دہ۔۔۔اور جدید ثابت نہ ہوا۔۔۔کہ نشست پر T.V وغیرہ کی نشریات میں محو ہو کر خود کو مصروف کرلیا جاتا۔۔۔اس جہاز میں لطف و اکرام کا تمام تر دارومدار۔۔۔ میزبان عملے کی پیشہ ورانہ خدمات پر تھا۔۔۔بورڈنگ کا مرحلہ تکمیل پا جانے کے بعد۔۔۔طیارے نے رن وے کو خیر باد کہا اور فضا میں بادلوں سے اُوپر اُٹھنے کو اپنا راستہ بنانے نکل کھڑا ہوا۔ جہاز کے ساؤنڈ سسٹم پر ایئر ہسٹر کے معمول کے مطابق جب یہ بتایا جارہا تھا کہ ہم اِتنے درجہ حرارت میں۔۔۔اِتنی بلندی پر اور فلاں ملک کی فضائی حدود میں محوِ سفر ہیں۔۔۔میرے بائیں ہاتھ کی نشست پر جو صاحب براجمان تھے،ان صاحب کا اسمِ گرامی ''رسول پاشا'' تھا۔۔۔ان کی اہلیہ جودت رسول پاشا بھی اسی جہاز میں ان کی ہمسفر تھیں۔ کسی وجہ سے انھیں ایک ساتھ سیٹ دستیاب نہ ہو سکی تھی۔۔۔ رسول پاشا پیشہ ورانہ طور پر استنبول یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ تھے۔۔۔ ادبیات ان کی دلچسپی تھی۔۔۔ جب کہ ان کی اہلیہ جودت رسول پاشا بھی اسی شہر میں ایک چھوٹا سا ڈیپارٹمینٹل سٹور چلا رہی تھیں۔ دونوں میاں بیوی بحرین میں مقیم ایک عزیز کی دعوت پر اُن کے ہاں چند یوم گزار کر واپس آرہے تھے۔۔۔رسول پاشا صاحب غیر ملکی زبان کے طور پر عربی روانی سے بول سکنے پر قادر تھے جب کہ انگلش کے حوالے سے اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ زیادہ رواں نہیں ہے حالانکہ وہ مجھ سے نہایت

شستہ انگلش ہی میں بات کر رہے تھے۔۔۔اور بغیر کسی دقت کے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت کا اظہار کر رہے تھے۔۔۔ اپنی مسز کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ انگلش سیکھنے میں وہی ان کی ''استاذ'' ہیں۔۔۔مشروبات اور لنچ باکسز کی فراہمی کے مراحل طے ہو چکے تھے۔۔۔وقفے وقفے سے رسول پاشا سے تبادلہ خیال جاری تھا۔۔۔خاص طور پر جب میں نے جوابی تعارف میں اپنے آپ کو دلدادۂ شعر و ادب بتایا تو رسول پاشا صاحب نے غالباً مجھے اپنے مکالمے کے لیے زیادہ معقول آدمی خیال کرلیا تھا۔۔۔یہی وجہ تھی کہ اُن کے اندازِ تکلم میں اعتماد کا وہ عنصر بھی دکھائی دینے لگا تھا جس کی بدولت متکلم کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے سامع تک۔۔۔اس کے نقطۂ نظر کی پوری طرح ترسیل ہو رہی ہے اور اس کا مدعا و استدلال پوری دلچسپی سے سنا جا رہا ہے۔۔۔ حقیقت بھی یہی ہے، ضروری نہیں کہ ہر آدمی ہر آدمی کے سطحِ اظہار بیان کے مطالبات پر پورا اُترتا ہو۔۔۔ اتفاق سے ان کی گفت گو کا محور۔۔۔ترکی تاریخ و ادب ہی قرار پایا تھا۔

ترکش ایئر لائنز کی اس ایئر بس میں رسول پاشا صاحب سے ملاقات میری ترک تاریخ، ثقافت ،ادب اور سماج کو سمجھنے کے لیے میرے لیے کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھی۔ان سے ملاقات میرے لیے اس شگون کا باعث بھی تھی کہ میرا یہ سفر ثقافتی و علمی سطح پر میرے لیے یادگار ثابت ہوگا۔ رسول پاشا صاحب مجھے وہ اپنی ثقافت اپنی زبان اور اپنی تاریخ سے انتہائی آگہی رکھنے والے دانشور محسوس ہوئے۔۔۔ چونکہ تاریخ پیشہ ورانہ طور پر رسول پاشا صاحب کا مضمون بھی تھا لہٰذا فطری طور پر اس حوالہ سے انھیں عام آدمی

سے زیادہ علم کا حامل انسان ہونا چاہیے تھا، جب میں نے اُسے بتایا کہ ترک ثقافت اور ہسٹری سے آگہی کا جذبہ بھی میرے اس سفر کا ایک محرک ہے تو میرے لیے اُن کی گرم جوشی میں کسی قدر اضافہ ہوگیا۔۔۔ غالباً اسی وفورِ جذبات میں انھوں نے اس یقین دہانی کے ساتھ فی الفور ''دعوتِ سوال'' دے ڈالی کہ ترکی کے حوالے سے کوئی بھی سوال جو میرے ذہن میں ہو وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔۔۔ترک تاریخ کے حوالہ سے بہت سے سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر میں طیارے کی اندرونی فضا کو کلاس روم نہیں بنانا چاہتا تھا۔۔۔مگر یونہی محض ''انٹرایکشن'' کے لیے میں پوچھ بیٹھا کہ'' کیا ترک عربی النسل قوم ہے۔۔۔''تو وہ مسکرائے اور بولے'' آپ کو ایسا مغالطہ کیوں ہوا؟۔۔۔کیونکہ نسلی طور پر ترک قوم کو عرب سے کوئی ایسی قریبی نسبت نہ ہے۔نسبی اعتبار سے ترک اپنی معلوم نسبی تاریخ کی جڑیں آدم ثانی حضرت نوحؑ سے ملاتے ہیں۔۔۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے'' حام، سام اور یافث'' تھے۔ یافث کے بیٹے کا نام ترک تھا جو ترک بن یافث کہلایا۔اس کی اولاد میں سے ایک شخص النجہ خان کے ہاں دو توام بیٹے پیدا ہوئے جن کا نام بالترتیب منگول خان اور تاتار خان رکھا گیا۔ انھی دو بھائیوں کے نام پر منگول اور تاتاری قبیلے وجود میں آئے۔ منگول قبیلہ چین کے جس حصے پر آباد ہوا،وہ منگولیا کہلایا جب کہ تاتاریوں کا دریائے جیحوں کے کنارے سکونتی علاقہ ترکستان کہلایا۔ایک زمانہ میں یہ علاقہ شہنشاہ فریدون کے بیٹے تور کے زیرِ نگیں بھی رہا

اس لیے اِسے توران بھی کہا جاتا رہا۔۔۔اس علاقے کے باشندوں کو ترکمانِ غزاور علاقے کو ترکمانستان کا نام بھی دیا گیا۔۔۔اس خطے کے سلاطینِ قدیم میں ایک معتبر ترین نام افراسیاب کا بھی ہے جو کہ کیانی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔۔۔ بعدازاں افراسیاب کی اولاد تاتاریوں سے عائلی انٹرایکشن کے نتیجے میں تاتاریوں ہی میں مدغم ہوگئی۔۔۔افراسیاب کی اس اولاد سے ایک سلجوق نامی شخص اُبھرا کہ جس نے اپنے قبیلے کے ساتھ نواحِ بخارا میں آ کر اسلام قبول کیا۔اسی سلجوق کی اولاد کو ترکوں کا سلجوق قبیلہ کہا جاتا ہے۔۔۔ بعدازاں اس قبیلے سے طغرل، الپ ارسلان اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے عالی جاہ سلاطین پیدا ہوئے۔

تاتاریوں کا قدیم پیشہ ملک فارس وخراستان کے اندرونی علاقوں میں گروہی طور پر لوٹ مار راہزنی کا تھا۔۔۔ بعدازاں تاتاری قبیلے خراسان، ایران، عراق،شام سے ہوتے ہوئے ایشیائے کوچک تک جا پہنچے۔۔۔نسبی لحاظ سے ترکستان میں رہنے والے ترکوں یعنی تاتاریوں کے جس قبیلے کی ترک تاز کے نتیجے میں سلطنتِ عثمانیہ کی بنیاد استوار ہوئی وہ قبیلہ ترکانِ عثمانی کے نام سے مشہور ہوا۔ترکمان عثمانی کے یہاں ''بک''،''بے'' کا خطاب اکثر پایا جاتا ہے۔۔۔ جب کہ مغلوں کے لیے میرزا، مرزا کا خطاب زیادہ پسندیدہ رہا جب کہ''بیگ'' کا خطاب تاتاریوں اور مغلوں دونوں کی مشترکہ میراث محسوس ہوتا ہے۔

ترک ایسا عام لفظ ہے کہ جو منگول (جو کثرتِ استعمال سے مغول اور بعدازاں مغل ہوگیا) اور تاتاریوں کے ہر قبیلہ کی بابت بولا جاسکتا ہے۔یوں بھی علاقائی حوالے سے الگ الگ خطے میں بودوباش وترقی کے نتیجے میں ان دونوں ترک شاخوں میں اس قدر دُوریاں اور عداوتیں عمل میں آ گئیں کہ تاریخ ان کی باہمی جنگوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔۔۔ایک طویل عرصے تک تاتار کو جنگی طور پر فریدون وافراسیاب کی پشت پناہی حاصل رہی جس کے نتیجے میں وہ صدیوں منگول قبیلے کو دبانے اور شکست خوردہ رکھنے میں کامیاب رہے۔ان لڑائیوں میں منگول عورتیں اکثر تاتاریوں کے ہاتھ آ جاتیں۔۔۔ان عورتوں سے تاتاریوں کی جو اولاد ہوتی اُسے تاتاری اپنے ترکہ کا وارث نہیں جانتے تھے بلکہ ''باندی بچہ'' خیال کرتے تھے۔مفتوحہ منگول عورتوں سے تاتاریوں کی اولاد کو''افراتاتار'' کہا گیا کہ جو بعدازاں ''ترکمان'' کے طور پر مشہور ہوئے۔

جب تاتار یا ترکمان مسلم سلطنتوں کا حصہ بننے کے بعد متمدن ہوگئے تو منگولوں کو سر اُٹھانے کا موقع مِل گیا۔۔۔اور پھر منگولوں نے اپنی تاریخی ذلتوں کا انتقام لیتے ہوئے۔۔۔ بلادِفارس وعراق وشام تک خون کی وہ ندیاں بہائیں کہ جو صدہا سال تک خشک ہونے میں نہ آئیں۔

دُنیا میں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا کون ایسا ہوگا کہ جو چنگیز خاں جس کا پیدائشی نام تموچین تھا اور تیمورلنگ کو نہیں جانتا ہوگا۔۔۔ بعدازاں اسی منگول قبیلے سے جو قبائلی شاخیں پھوٹیں انھیں قبائل منگولیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ قبائل منگولیہ یا مغولیہ میں قپچاق، ایغور، خلج، قاچار، افشار، جلائر، قیات ارلات، دوغلات، قنطرات، سلدوز، ارغون، قافلی، توچین، ترخانی، طغائی اور قاقشال وغیرہ کے نام شامل ہیں جب کہ ازبک قبیلہ جو کہ آج ایک الگ مملکت کی حد تک پھیل چکا ہے۔ چنگیز خان ہی کی اولاد میں سے ایک شخص سے منسوب ہے۔اور یہ قبیلہ ایک زمانے میں سرزمین تاتار یعنی ترکستان کا بھی حاکم وقابض رہ چکا ہے۔

جناب رسول پاشا نے ترکوں کی نسبی تاریخ کے حوالے سے مختصر سے وقت میں مجھے اتنی سیر حاصل معلومات مہیا کر دی تھیں کہ ترکی میں قیام کے دوران میرے لیے ان کی ذاتِ گرامی سے استفادہ ضروری ہو گیا تھا۔۔۔ میرا خیال تھا کہ ترکی کے حوالہ سے علمی معلومات کے حصول کے لیے رسول پاشا بہترین آدمی ثابت ہوں گے میں نے اِن سے اپنا مدعا برملا بیان کر دیا۔۔۔میری خواہش کے اظہار پر انھوں نے خوش دلی سے ہر قسم کی معاونت فراہم کرنے کا وعدہ اس شرط کے ساتھ کیا کہ میں ان سے کم از کم ایک دو یوم قبل پیشگی پروگرام طے کر کے ملاقات کرسکتا ہوں۔اس حوالہ سے انھوں نے اپنا تعارفی کارڈ جس پر اُن کا موبائل فون نمبر بھی موجود تھا فوراً عطا فرماتے ہوئے کہا کہ ''علمی لحاظ سے انھیں میرے کسی کام آ کر خوشی محسوس ہوگی۔''

ترک ہسٹری میں میری دلچسپی کو انھوں نے تعجب کی نگاہ سے اس لیے بھی نہیں دیکھا کہ بقول اُن کے جنگِ عظیم کے بعد جب ترک قوم اپنی بقا اور آزادی کی فیصلہ کن جدوجہد میں مصروف تھی۔ برصغیر میں تحریکِ خلافت جس کا کہ براہِ راست تعلق ترکی کی صورتِ حال سے بنتا تھا زوروشور سے جاری تھی۔۔۔ ان کا کہنا تھا ''جس طرح ہم لوگ اپنی آزادی کی

جدوجہد کے دیگر اقوام پر اثرات ورد عمل کے حوالے سے تحریکِ خلافت کا تجزیہ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اسی طرح پاک و ہند کے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ جب بھی ہم ترکوں سے ملتے ہیں یہ جاننے کی خواہش کرتے ہیں کہ ترکوں نے اُن کی طرف سے برپا کی جانے والی تحریکِ خلافت کو کس نظر سے دیکھا؟''

میں نے پوچھا''کیا اس حوالے سے پہلے بھی کسی پاکستانی یا بھارتی سے آپ کا تبادلہ خیال ہو چکا ہے؟''

بولے''بہت مرتبہ ایک تو پاکستان اور بھارت سے بہت سے اہلِ علم یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ دوسرا برصغیر نژاد بے شمار خاندان یہاں آباد ہیں جن سے اکثر تبادلہ خیالات ہوتا رہتا ہے۔اگر آپ مجھے موقع دیں گے تو میں آپ کی ملاقات نئی نسل کے بہت سے ایسے افراد سے کروا سکتا ہوں جن کا آبائی پس منظر انڈو پاک سرزمین ہے یا دوسرے لفظوں میں جنھیں ہندنژاد ترک کہا جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ''میں آپ کی اس خصوصی فیور (Favour) کا بہت ممنون رہوں گا۔''

استنبول ایئرپورٹ پر لینڈنگ کے لیے ابھی غالباً گھنٹہ بھر کی اُڑان باقی تھی۔۔۔ میں نے تاریخ کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے تحریکِ خلافت کی بابت سوال کیا کہ ترک قوم برصغیر کی اس دور کی اس اہم سیاسی تحریک کو کس تناظر میں دیکھتی ہے۔۔۔ جواباً اُنھوں نے کہا''اس سوال کا جواب تاریخ ہماری بہت سفاک انداز میں دیتی ہے۔ ڈاکٹر کے کروجر اپنی کتاب ''کمالسٹ ٹرکی اینڈ دی مڈل ایسٹ'' (Kamalist Turky and the Middle East) میں انڈین مسلم فوجوں کے حوالے سے لکھتا ہے:

''ہندوستانی مسلمان فوجیں، شام، فلسطین اور خاص کر میسوپوٹامیہ (موجودہ سرزمین عراق ،اُردن) میں اپنے ہم مذہبوں سے عیسائی افسران کی ماتحتی اور نگرانی میں لڑیں اور ایک بھی واقعہ بغاوت یا حکم عدولی کا پیش نہیں آیا۔''

ہماری تاریخ اس اَمر پر بھی قطعاً پردہ نہیں ڈالتی کہ ''تحریکِ خلافت'' کے آغاز سے پہلے 1918ء میں اتحادیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فوجیں (جن میں مسلمان فوجیوں کی تعداد بہت غالب تھی) بھی استنبول کے بازاروں سے فاتحانہ پریڈ کرتی ہوئی گزریں۔ ہندوستانی فوجوں نے ترکوں پر فتح مند اقوام کے مقبوضات کے نمائندے کے طور پر سلطنت عثمانیہ کے پایۂ تخت میں فاتحانہ مارچ میں حصہ لیا۔ تاہم ہماری ہی تاریخ اس سلسلہ میں تاریخ اپنے جبر کے حوالہ سے دوسرا رُخ یہ دِکھاتی ہے کہ محاذِ جنگ پر اتحادی افواج میں شامل وہ ہندوستانی مسلمان فوجی جو اپنے کمانڈروں کی حکم عدولی کرتے ہوئے ہتھیار چھوڑ دیتے انھیں فوراً پھانسی دے دی جاتی اور پھانسی کے لیے جو رسی استعمال کی جاتی وہ سور کے چمڑے کی بنی ہوئی ہوتی۔ جنگِ عظیم کے دوران اسی ''فارمولے'' کے تحت 1915ء کے اوائل میں انگریز استعمار نے رنگون کے محاذ پر تعینات بلوچ رجمنٹ کے تقریباً دو سو مسلمان فوجیوں کو ترک سلطنت کی خفیہ تنظیم ''تشکیلاتِ مخصوصہ'' کا آلۂ کار بننے کے نتیجے میں ''بغاوت'' کے جرم میں تختۂ دار پر لٹکا دیا، جہاں تک تحریکِ خلافت کا سوال ہے تو اس حوالہ سے ہمارے بعض مؤرخین کی جانب سے کیے گئے تجزیوں کے نچوڑ کے طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر کی تحریکِ خلافت ترک قوم پرستوں کی جدوجہد آزادی سے کسی طرح کے سروکار کی بجائے محض ''خلافت کے ادارہ'' کو بچانے کی ایک کوشش تھی۔اسی زمانے کی بہت بڑی انشاپرداز، آتش بیان اور ہماری ایک مصلح، مقرر، دانشور خاتون۔۔۔''خالدہ ادیب خانم آدی وار'' گزری ہیں۔ ترقی نسواں کی تحریکوں میں پیش پیش ہونے کے ساتھ ساتھ ترکی کی انقلابی جدوجہد اور جنگِ آزادی میں سرفروش مجاہدہ کی طرح لڑیں۔ 1935ء میں انھوں نے ہندوستان کا تفصیلی دورہ کیا۔۔۔اور بعدازاں''اِن سائیڈ انڈیا'' کے نام سے ٹریولاگ لکھا، جو حال ہی میں میری نظر سے گزرا۔۔۔اس میں انھوں نے بڑی وضاحت سے اس ساری صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق مسلمانانِ ہند خلیفہ کو ملتِ اسلامی کا روحانی سردار سمجھتے تھے۔تصورِ خلافت۔۔۔مسیحی تصور پاپائیت سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ خلیفہ کے لیے دُنیاوی حکومت لازمی تھی۔سلاطینِ ترک جو خلیفہ بھی تھے، انھیں اپنے منصب کے لیے دُنیاوی اقتدار رکھنا ضروری تھا۔گویا منصبِ خلافت کی بقا کا دوسرا مطلب یہی تھا۔ عثمانی سلسلۂ ملوکیت حسبِ سابق قائم ودائم رہے۔

جنگِ عظیم اول میں ترکوں کی شکست نے ترک قوم کی آزادانہ بقا کو معرضِ خطر میں ڈال دیا تو ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن میں نقش ہو گیا کہ خلافت بھی معرضِ خطر میں آ گئی ہے۔ برطانوی اربابِ سیاست خلافت وسلطنت کے باب میں اس

مبین نکتے کو بخوبی سمجھ گئے تھے،اس لیے بار بار اعلان کرتے رہے کہ جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہو خلیفہ اپنی دُنیاوی حکومت سے محروم نہ کیا جائے گا۔ المختصر بہت سے تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ تحریکِ خلافت کا ہنگامہ بظاہر اس قدر ترکوں کی ہمدردی میں نہ تھا جتنا کہ ایک ادارے کی بقا کی خاطر تھا حالانکہ اس میں خود ترکوں کی بیخ کنی اور محکومی کا پورا سامان نظر آ رہا تھا۔

جنوب ایشیائی مسلمانوں پر تاریخ کے جبر کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ عین اس وقت جب ترک قوم اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔۔۔ خود جنوب ایشیائی مسلمان بھی نیچۂ استبداد سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ترک افواج آزادی اور جنوب ایشیائی مسلمانوں کے مابین "کمیونیکیشن گیپ" کی وجہ سے فکری سطح پر اتحادِ فکر و اتفاقِ عمل سوفی صد سطح تک ممکن نہیں تھا۔ دوسرا دونوں خطوں کے مسلمانوں کی مشکلات اِن کے اپنے اپنے تناظر میں دیکھی جائیں تو تحریکِ خلافت کی اساس اخوتِ اسلامی سے اخلاص کا خاصہ ہی قرار پاتی ہے۔۔۔ تحریکِ خلافت نے ترکوں کو جنوب ایشیائی مسلمانوں کی خود سے وابستگی کا جہاں ایک حوصلہ افزا احساس دِلایا وہاں خود جنوب ایشیائی مسلمانوں کے لیے یہ تحریک۔۔۔ تحریکِ آزادی کے لیے تحرک کی بنیاد بن گئی۔۔۔ ترکی میں اس حوالے سے بہت کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں میم کمال اوکے کی ایک کتاب "تحریکِ خلافت" (1919-1924ء) تاریخی مطالعہ 1988ء میں منظر عام پر آئی جس میں تاریخی دستاویزات کی بنیاد پر ثابت کیا گیا ہے۔۔۔ کہ جنوب ایشیائی مسلمان تحریکِ خلافت کے ذریعے عالمی سیاسی تناظر میں ترکی کی جدوجہدِ آزادی میں مؤثر کردار ادا کرنے میں کامیاب رہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے منطقی نتیجے "معاہدہ سیورے" کے زمانے میں "اکابرینِ تحریکِ خلافت" بالخصوص مولانا محمد علی جوہر نے مصطفیٰ کمال پاشا کو ٹھوس یقین دہانی کروائی کہ اب مسلمان انگریزوں کے لیے ترکوں کے خلاف فوجی خدمات سرانجام نہیں دیں گے۔ انگریز قبل ازیں اپنی زیادہ تر فوجی ضروریات مسلم انڈیا سے پوری کرتے تھے لیکن تحریکِ خلافت کی جدوجہد کے نتیجے میں انگریز کے لیے ترکوں کے خلاف تازہ فوجی کمک حاصل کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ ترکی کے لیے خدمات کے باب میں تحریکِ خلافت کا وہ کردار کہ جو اس نے معاہدہ سیورے میں ترمیم کے حق میں برطانیہ پر فیصلہ کن دباؤ ڈالتے ہوئے ادا کیا۔ ترک قوم کے لیے ناقابلِ فراموش اَمر ہے۔ ترک قوم کبھی نہیں بھول سکتی کہ اکابرینِ تحریکِ خلافت نے معائدہ سیورے۔۔۔ جو کہ عثمانی خلیفہ محمد وحید الدین نے رُسوا کن شرائط کرتے ہوئے منظور کیا تھا۔ اُسے منسوخ کرتے ہوئے اقوامِ عالم سے ترکوں کے ساتھ آبرومندانہ سلوک کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر مجلس خلافت نے اپنے انگریز حاکموں کو واشگاف الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر انھوں نے ترکوں پر من مانی شرائط مسلط کرنے کی کوشش کی یا انھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ آپ کرنے کا حق نہ دیا تو وہ انگریزی مقبوضات میں زبردست خلفشار برپا کر دیں گے اور یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس سلسلہ میں تحریک و مجلسِ خلافت نے محض زبانی جمع خرچ سے کام نہیں لیا بلکہ ایسے اقدامات کیے کہ جن سے انگریز واقعتاً دباؤ میں آ سکتا تھا۔ تحریکِ خلافت کے پلیٹ فارم سے ترکوں کی اس ٹھوس مدد و اعانت کے شواہد وہ تاریخی دستاویزات بھی ہیں جو آج پاکستان، ہندوستان، انڈیا، آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔

ہمارا مؤرخ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ترک جدوجہدِ آزادی کی کامیابی کے فوراً بعد خلافت کانفرنس کے عام اجلاس میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی خدمت میں جو پیغام بھجوانے کا فیصلہ ہوا اور بعدازاں اس بھجوایا گیا۔ اس کا متن کچھ اس طرح کا تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمان ترکوں کے عظیم رہنما غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو عقیدت سے سلام پیش کرتے ہیں اور دُشمنانِ اسلام کے خلاف بے مثال بہادری، جرأت، اسلام کی سربلندی کے لیے بے مثال ایثار بے لوث خدمت خلوصِ نیت و عمل کے مظاہرے پر انھیں مبارکباد دیتے ہیں اور اپنی مکمل حمایت کا یقین دِلاتے ہیں۔" اس اجتماع میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو بطور سپہ سالار اسلام ایک "تلوار" اور حکومتِ ترکی کو دو ہوائی جہاز (جن کی قیمت اس زمانے میں تقریباً 32 ہزار پونڈ تھی کہ خرید کے لیے نقد رقم کی صورت میں) بطور تحفہ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ تحائف بھی "اتاترک" کی خدمت میں ارسال کیے گئے۔

بہر طور تحریکِ خلافت ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر گفتگو کی کوئی نشست بھی فیصلہ کُن نتائج دینے معاون نہیں ہو پاتی۔۔۔ تاریخ برصغیر کے حوالے سے بھی تحریکِ خلافت کی ناکامی و کامیابی کے مباحث نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکے۔۔۔ اس کے باوجود اس کی تاریخی اہمیت سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان، برطانیہ کے زیرنگیں تھا اور قیامِ پاکستان کے ظہور کا دُور دُور تک کوئی شائبہ دِکھائی نہ پڑتا

تھا۔۔۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی ایک طرح سے مسلمانانِ ہند کو بین الاقوامی سیاست میں آزادانہ فیصلے کرنے کی طاقت میسر آئی۔۔۔ اس وقت سے لے کر آج تک بین الاقوامی سیاست میں پاکستان اور ترکی ایک دوسرے کے سب سے بڑے حلیف اور ثابت قدم دوست ثابت ہوئے ہیں۔ ترک قوم کا ہر فرد اس حقیقت سے کامل آگاہ ہونے کے باوصف پاکستانیوں کا مشکور رہتا ہے۔ تحریکِ خلافت سے نکل کر گفتگو کے پاک، ترکی تعلقات کے دور میں داخل ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے اگرچہ ابھی ''تحریکِ خلافت'' ہی ایک ایسا موضوع تھا کہ جس پر مختلف حوالوں سے تشنہ طلب گفتگو آگے بڑھائی جاسکتی تھی مگر فضائی عملے کی تیاریوں اور مسافرانِ کرام کی ایکٹویٹی سے محسوس ہو رہا تھا کہ منزل چند منٹ کی دُوری پر ہے۔۔۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ ''کپتان کیبن'' سے سیٹ بیلٹس باندھ لینے کے اعلان نے مطلع صاف کر دیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد طیارے نے استنبول کی مشہورِ زمانہ مساجد کے مینار۔۔۔ سمندر کے شرقی و غربی کناروں اور ان کو باہم ملانے والے پل کے طائرانہ مناظر نگاہوں کے رُوبرو تھے۔ بقول خالد اقبال یاسر:

؎ منظر نظر اُونچے بُرج اس کے اُبھر رہے تھے
وہ قریۂ نور ہر کسی کے دھیان میں تھا

جہاز سے اُتر کر ترکی کی سرزمین کو اپنے پاؤں سے چھوا اور جناب افتخار عارف کا نہایت برمحل یہ شعر:

؎ روش میں گردشِ سیارگاں سے اچھی ہے
زمیں کہیں کی بھی ہو آسماں سے اچھی ہے

وردِ زبان کرتے ہوئے اُنھیں دُعا دی۔

حسبِ معمول ایوی ایشن بسیں مسافروں کو ٹرمینل پہنچانے پر پہلے سے مامور تھیں۔۔۔ کنویئر بیلٹ سے سامان وصول کیا۔۔۔ اسی دوران رسول پاشا نے اپنی اہلیہ جودت رسول پاشا سے باقاعدہ رسمِ تعارف ادا کی مسز جودت رسول پاشا نے ہاتھ ملاتے ہوئے حالتِ غنودگی میں مجھے ڈسٹرب کرنے پر معذرت کی۔ رسول پاشا نے میرے قیامِ استنبول کے دوران ''وزٹ'' دینے کی دوبارہ دعوت دیتے ہوئے اجازت چاہی اور مقامی امیگریشن کاؤنٹر سے ہوتے ہوئے روانہ ہو گئے۔۔۔ رسول پاشا اُن لوگوں میں سے تھے کہ جو گفتگو کرتے ہیں تو اپنے ہمکلام کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ان سے مکالمہ کرنے والا بے ساختہ تسلیم کر اُٹھتا ہے کہ بقول رئیس امروہوی:

ہر ذرّے میں ہے سامعہ بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ

دُنیا بھر میں غیر ملکیوں کے لیے ہر ایئرپورٹ پر امیگریشن کا معمول ایک حساس معاملہ خیال کیا جاتا ہے۔ خصوصاً جب غیر ملکی ''پاکستانی'' ہوں تو حکام بہت سے معاملات کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ بطور قوم ترک پاکستانیوں کو اپنا ہمدرد دوست اور بہی خواہ خیال کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امیگریشن آفیسر کے رویے سے ایک خاص طرح کی خوشگواریت عود کرتی ہوئی دِکھائی دیتی تھی۔ اس نے مجھے پاسپورٹ پر انٹری اسٹیمپ کرتے ہوئے جہاز کے عملے کی طرح ''گڈ سٹے'' وِش کیا حالانکہ اخلاقیات کا یہ مظاہرہ اس کے فرائضِ سرکاری میں عین ممکن ہے شامل نہ ہو۔ ایئرپورٹ سے ایگزٹ پر دیکھا کہ ایک ہڑبونگ یعنی ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔۔۔ ہر عمر کے لوگوں پر مشتمل جس میں نوجوانوں کی تعداد کثیر تھی۔۔۔ نعروں پر نعرے لگاتے چلے جا رہے ہیں۔۔۔ نعرے چونکہ ترکی زبان میں لگائے جا رہے تھے اس لیے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کیا نعرے لگا رہے ہیں۔۔۔ اور ان کی اس زور و شور اور جوش و خروش سے نعرہ زنی سے کیا مراد ہے۔۔۔ ایک لمحے کے لیے میرا دھیان اپنی اور اپنے ہمراہیوں کی نسبت سے وفد کے ترکی آمد کے پیشِ نظر کسی نظم کی دو لائنوں میں بندھے مضمون کی طرف بھی گیا جو کچھ اس طرح سے ہے:

''گدھ اُترے ہیں
سات سمندر پار سے دیکھو گدھ اُترے ہیں''

میں نے گمان کیا کہ ہوسکتا ہے اس کراؤڈ کو کسی نے ہماری سرزمین ترکی پر جہاز سے اُترنے کی اطلاع دے دی ہو اور وہ ہمیں دیکھنے کے لیے جوق در جوق چلے آئے ہوں اور ترکی زبان میں نظم کی مذکورہ دو لائنوں کا مضمون ہی دُہراتے چلے جا رہے ہیں۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد منظرنامے میں تبدیلی ظہور پذیر ہوئی اب سینکڑوں نوجوان ایئرپورٹ سے نکلنے والے چند نوجوانوں کو اپنے کندھوں پر اُٹھانے کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا جتن کر رہے تھے۔۔۔ میرا خیال تھا کہ اس جمِ غفیر کو کسی نے جعفر حسن مبارک کی استنبول آمد کی اطلاع ہی نہیں دی تھی۔۔۔ وگرنہ کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ ''جعفر حسن مبارک'' کے دستیاب ہونے کے باوجود اُسے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے غیروں کو کندھوں پر اُٹھانے کے لیے دھکم پیل کرتا پھرے۔۔۔ معلوم ہوا کہ کندھوں پر اُٹھائے جانے والے ترکی کی قومی فٹ بال ٹیم کے ممبران ہیں جو ورلڈ کپ فٹ بال کے کوالیفائنگ راؤنڈ میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے کے بعد واپس وطن پہنچے ہیں۔

فٹ بال کا ایک ادنیٰ کھلاڑی اور شائق ہونے کی حیثیت سے مجھے خوب علم تھا کہ ترک عوام فٹ بال

سے جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں۔۔۔فٹ بال کے لیے ان کی اِسی محبت کا نتیجہ تھا کہ 2002ء کے فٹ بال ورلڈ کپ میں جو کہ جاپان اور جنوبی کوریا میں آرگنائز کیا گیا تھا۔۔۔ترکی کی قومی فٹ بال ٹیم نے وکٹری سٹینڈ پر تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔۔۔اس کے ساتھ ساتھ ترکی کی کم ازکم تین ایسی فٹ بال کلبز ہیں جو یورپ کے بڑے فٹ بال ٹورنامنٹس میں ہمیشہ نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتی آئی ہیں۔اور یہ کلبز انٹرنیشنل فٹ بال نیوز میں مسلسل ''اِن'' رہتی ہیں۔انٹرنیشنل سطح کی ان فٹ بال کلبز میں خاص طور پر ''گالاتا سارے'' Glatasaray ایسی کلب ہے۔جس نے کہ 2000ء کے فٹ بال سیزن میں یورپی یونین کی سطح پر کھیلے گئے دو اہم ٹورنامنٹس Uefa Cup اور Uefa Super Cup جیت کر۔۔۔عالمی سطح پر فٹ بال کی دُنیا میں کھلبلی مچا دی تھی اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ ترکی کے قومی کھیل کی حیثیت فٹ بال کی بجائے سلطنتِ عثمانیہ کے دور ہی سے دیسی کشتی جیسے انگریزی میں Oiled Wrestling کہا جاتا ہے کو حاصل ہے۔۔۔

ایئرپورٹ کے باہر برپا ہونے والی استقبالیہ صورتِ حال جاننے کے بعد مجھے پاکستانی کرکٹ، ہاکی، سکوائش اور فٹ بال وغیرہ سے متعلق کھلاڑیوں پر رشک آیا۔۔۔جنھوں نے ایک مدت سے مجال ہے کبھی کوئی ایسی حرکت کی ہو جس سے پاکستان میں کھیلوں کے شائقین کے کاندھوں پر اس طرح کا بارِگراں ڈالنے کی ضرورت پیش آئے۔اپنے پلیئرز کا استقبال کرتے ہوئے ''کراؤڈ'' نے جس نفسیات کا مظاہرہ کیا تھا۔۔۔وہ نفسیات حیران کُن حد تک ''پاکستانی'' تھی۔۔۔

ہمارے وفد کے ساتھی بھی یکے بعد دیگرے امیگریشن کلیئرنس کے بعد۔۔۔باہر نکل رہے تھے۔ ایک طرف ظفر کھوکھر، لیاقت خان، سہیل احمد، افتخار الدین، نصر الدین، طیب گردیزی ایک دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کو لفظوں کی ڈور سے باندھنے میں مصروف تھے تو دوسری طرف عمران الحق، عامر عارف بھٹی، سہیل فاروق، سکندر شہزاد، ذکاء اللہ خان۔۔۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اظہار خیال کو پیرایۂ اظہار کے چناؤ کے لیے باہمی طور پر صلاح مشورے میں مصروف تھے۔شکور پراچہ، آغا علی خاں، شوکت سعید، بابر شیخ، راس مسعود، محمود علی خاں کی بابت معلوم ہوا۔۔۔کہ ابھی ضابطے کی کارروائی سے فراغت نہیں پا سکے۔۔۔عارف بھٹی، باجوہ۔۔۔اکبر اعوان، ملک فردوس عالم، سیّد آفتاب حسین زیدی میرے قریب ہی موجود تھے۔جب کہ مسز محمد اقبال، فرمان آفریدی، عنایت اللہ خلیل اس رُعب دار آواز کے منبعٔ دھن کی طرف متوجہ تھے جس میں سوال اُٹھایا گیا تھا کہ کوئی رہ تو نہیں گیا۔اس عالم میں ہم نے قنبر حمید کو سروں کی گنتی پوری کرنے کے سلسلہ میں متفکر پایا۔قنبر حمید صاحب کو جب یقین دِلا دیا گیا۔۔۔کہ نفری پوری ہے تو قافلے کو ایئرپورٹ سے اپنے قیام کے لیے منتخب کیے گئے ہوٹل کی طرف سے موجود ''کوچز'' پر سواری کی اجازت مرحمت فرما دی گئی۔سامانِ سفر کو چیز پر منتقل کیا جا چکا تھا۔۔۔

چلو چلو ہالیڈے اِن چلو۔۔۔کی دُھن میں۔۔۔شاید بہت کم احباب نے استنبول کی ہواؤں کے اُن تند خو جھونکوں کا نوٹس لیا ہو جو میزبان ملک کی فضا کی طرف سے ہمارے خیر مقدم کا فرض ادا کیے چلے جا رہے تھے۔میں انھی جھونکوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے۔۔۔راستہ پر مطلوبہ کوچ کی طرف رواں ہوا ہی تھا اور میرا دھیان نہ جانے کدھر تھا کہ یک بارگی محسوس ہوا جیسے میں کسی نامعلوم فرد سے ٹکرا چکا ہوں، ٹکر اتنی شدید نہیں تھی اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ میرے ٹکراؤ کی وجہ سے متاثرہ شخص کی کوئی چیز تارکول کی پختہ سڑک پر گر گئی ہے۔۔۔کسی دوست کی کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کی تکرار سنائی دی۔۔۔مگر میں نے اس کے تجسس کو نظر انداز نہ کر پاتے دِل ہی دِل میں اُسے کامی شاہ کے لفظوں میں جواب دیا کہ:

پہلے یہ تتلیاں اُٹھانے دے
کیا ہوا سانحہ نہ پوچھ ابھی

سو میں نے فوراً اس شخص کو سنبھالا۔۔۔سڑک پر گرنے والی شے کو اُٹھایا۔۔۔تو معلوم ہوا کہ وہ ''سفید چھڑی'' تھی اور میرے ٹکراؤ کی بنیاد پر کسی شدید چوٹ سے بچ جانے والا آدمی نابینا تھا۔اپنی کوتاہی محسوس کرتے ہوئے دِل ہی دِل میں مَیں نے فوراً اپنے آپ کو کوسا ''مسٹر جعفر حسن مبارک۔۔۔وہ کہاں نابینا تھا۔۔۔نابینا تو 'تو' تھا۔۔۔بصارت ایسی نعمت کی ایسی بے قدری اور بے توقیری۔۔۔خدا کا خوف کر۔۔۔''

میں نے فوراً متاثرہ آدمی سے معافی مانگی مگر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اُس نابینا ترک کے لیے ''معاف کیجیے گا'' یا ''سوری'' جیسے الفاظ بے معنی ہوں۔۔۔وہ اُردو یا انگلش جانتا ہی نہ ہو۔اگر اس کے لیے میرے یہ الفاظ بے معنی بھی رہے ہوں تو مجھے یقین تھا، جس طرح میں نے اس کی چھڑی اُٹھا کر اس کے ہاتھ میں دوبارہ تھمائی تھی۔اس اندازِ عمل میں جو غیر مشروط معافی کی درخواست موجود تھی۔اُسے یقیناً شرفِ قبولیت مل گیا ہو گا۔نابینا۔۔۔اُدھیڑ عمر آدمی۔۔۔منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔۔۔نہ جانے مجھے صلواتیں سنا رہا تھا یا اپنے مقدر سے شکایت میں مصروف تھا۔میں اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

سری لنکا - امن اور خوشحالی کی راہ پر گامزن

عامر بن علی/ جاپان

سری لنکا کا نام سنتے ہی ذہن میں عموماً کرکٹ، ریڈیو سیلون، چائے یا پھر تامل ٹائیگرز کا خیال آتا ہے۔کولمبو ائیر پورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف جاتے ہوئے اندازہ ہوا کہ کسی بھی ملک کی عالمی شناخت کے پہلو تو مختصر ہو سکتے ہیں مگر حقیقت میں ہر دیس متنوع مزاج رکھتا ہے۔پچیس ہزار مربع میل کے اس سر سبز و شاداب جزیرے کے زمینی ہمسائے تو نہیں ہیں، فقط سمندری حدود ہے جو کہ بھارت اور مالدیپ کے ساتھ ملتی ہیں۔دو کروڑ آبادی کا یہ ملک مجھے پہلی نظر میں بے حد مذہبی رجحان کا حامل دکھائی دیا۔فی مربع میٹر عبادت گاہوں کی اتنی زیادہ تعداد اور تنوع میں نے دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔

کل آبادی کا ستر فیصد بدھ مت کا پیروکار ہے اور تیرہ فیصد لوگ ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں، مگر معاشرے میں مذہب کا عنصر اتنا اہم ہے کہ عیسائی ملکی آبادی کا فقط سات فیصد ہیں، اس کے باوجود کولمبو میں جتنے گرجا گھر اور دیگر نصرانی علامات میں نے دیکھی ہیں، اتنی آج تک کسی عیسائی اکثریت والی ریاست میں بھی نظر نہیں آئیں۔مسلمان آبادی کا دس فیصد ہیں، مساجد اور صوفی درگاہوں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ شمار کرنا مشکل ہے۔بدھ معبد، مندر، کلیسا، اور مساجد کی اتنی بڑی تعداد بھی یقیناً ایک وجہ ہوگی جس کے سبب معتبر عالمی تحقیقاتی ادارے "پیو" نے سری لنکا کو دنیا کا تیسرا سب سے زیادہ مذہبی رجحان رکھنے والا ملک قرار دیا ہے۔

ریاست کا سرکاری نام سوشلسٹ جمہوریہ سری لنکا ہے، مگر سوشلزم یہاں چین اور یورپ کی طرز کا کھلی منڈی پر مشتمل ہے، شمالی کوریا اور کیوبا کی طرح معیشت پر حکومتی اجارہ داری نہیں ہے۔چند سال پہلے ہی تیس سالہ طویل خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا ہے، جس کے بعد سری لنکا تیزی سے معاشی ترقی کرتا نظر آرہا ہے۔تامل ٹائیگرز کو جس طرح یہاں فوج نے شکست دی ہے اس سے ہمیں بھی یہ سبق ملتا ہے کہ مسلح گروہوں اور دہشت گردوں کے خاتمے کے لیے مسلح سیکورٹی اداروں کی کارروائی ہی واحد راستہ ہے۔تامل نسل یہاں کی کل آبادی کا دس، پندرہ فیصد ہے اور مذہبی اعتبار سے ہندو ہیں۔پچھتر فیصد آبادی سنہالی نسل سے تعلق رکھتی ہے جس میں سے غالب اکثریت بدھ مت ہے۔سری لنکا میں بدھ مت کی ابتدا کا قصہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔اشوک اعظم نے اپنے دورِ حکومت میں تبلیغ کی غرض سے اپنے حقیقی بیٹے کو بدھا کا پیغام دیکر سری لنکا بھیجا۔لنکا کے راج دربار نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کو پسند کیا اور بدھ مت اختیار کر لیا۔تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان میں یوں تو روزِ اول سے ہندو مذہب اکثریت میں ہے مگر آج تک کوئی ایک نامور حکمران ہندو نہیں گزرا ہے۔مورخین چھ بادشاہوں پر متفق ہیں کہ وہ سب سے طاقتور اور عظیم و دبنگ گزرے ہیں۔ان میں سے چندر گپت موریہ جین مت کا پیروکار تھا۔اس کے بعد اشوکا عظیم سلطنت کا بانی اور حکمران گزرا جو کہ بدھ مت کا ماننے والا تھا۔باقی چار بادشاہ مغل مسلمان ہیں۔اکبر اعظم، شاہجہان "معمار"، جہانگیر "شرابی" اور نگزیب "بنیاد پرست" تاریخ کہتی ہے کہ یہ چھ سب سے زیادہ جلیل القدر ہندوستانی شہنشاہ گزرے ہیں۔

ریڈیو سیلون میری پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے مگر یہ ہمارے ادب کا بہت اہم حوالہ ہے۔ریڈیو سیلون کو ملنے والی اہمیت اور توجہ قابل فہم بھی ہے کیونکہ یہ پورے ایشیاء میں، جب ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا تو پہلا ریڈیو اسٹیشن تھا۔جب تاج برطانیہ نے اپنی اس نو آبادی میں مختلف زبانوں میں ریڈیو سروس شروع کی تو چین، جاپان، ہندوستان سمیت کہیں بھی کوئی ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔گو کہ یورپ میں 1920 سے ریڈیو نشریات شروع ہو چکی تھیں۔یاد رہے کہ سری لنکا کا پرانا نام سیلون تھا۔1505 میں جب پرتگال نے اس جزیرہ نما پر قبضہ کیا تو اسے سائی لون کا نام دیا۔بعد ازاں یہاں ولندیزی حکمران آگئے۔بالآخر جب 1815 میں برطانوی قبضہ ہوا تو یہ سیلون کہلانے لگا۔1948 میں برطانیہ تو یہاں سے چلا گیا مگر ملک کا نام 1972 تک سیلون ہی رہا اور پھر ریڈیو سیلون ملک کے نام کی تبدیلی کے ساتھ ہی سری لنکا براڈ کاسٹنگ بن گیا۔

سیلون چائے کے باغات پانچ صدیوں پر محیط یورپی نو آبادیاتی عہد کی یادگار ہیں، یہاں کی چائے اب بھی دنیا بھر میں سری لنکا کی پہچان ہے۔نو آبادیاتی عہد کے اثرات یہاں ہر شعبہ زندگی پر نظر آتے ہیں۔طرز تعمیر کی بنیاد پر یہاں کی عمارات ہر عہد کی کہانی سناتی ہیں، زمانہ قدیم، ایرانی، عرب، پرتگالی، ولندیزی، برطانوی اور زمانہ جدید۔ہندو مذہب کے ماننے والے سری لنکا کو بھگوان کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو کہتے ہیں۔اگر نقشے میں سری لنکا کا جغرافیہ دیکھیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔مہا بھارت میں لکھا ہے کہ راونڈ

نے سیتا کو اغواء کر کے یہاں پر ہی قید کیا تھا۔ جب رام نے سیتا کی رہائی کے لیے لنکا پر حملہ بول کر اسے تہس نہس کر ڈالا تو وہیں سے ''لنکا ڈھانے'' کا استعارہ تشکیل پایا۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات جنہیں ''پالی اصول'' کہتے ہیں، پہلی مرتبہ یہاں ہی کتابی شکل میں مرتب ہوئیں۔ کولمبو سے دو گھنٹے کی مسافت پر حضرت آدمؑ کی جائے نزول ہے جسے ADAM PEAK کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی مذہب کے پیروکاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس پہاڑی چوٹی پر حضرت آدمؑ اترے تھے اور چوٹی پر ثبت نشان ان کے پاؤں کا ہے۔ بدھ بھکشوؤں کا مگر اصرار تھا کہ یہ بدھا کے پاؤں کا نشان ہے۔ اسی سبب سے یہ بھکشوؤں کی جائے عبادت ہے۔ خراب موسم کی وجہ سے میں چوٹی کی زیارت نہیں کر سکا مگر سوچتا رہا کہ مہاتما بدھ تو اپنی زندگی میں کبھی سری لنکا آئے ہی نہیں تھے؟ جہاں تک حضرت آدمؑ کا تعلق ہے تو ان کے بیٹے ہابیل کی قبر تو میں نے شام کے سرحدی شہر زبدانی میں دیکھی تھی، جہاں سے ایک طرف اسرائیل کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف لبنان کی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے ہجرت کر لی ہو۔ سری لنکا کی دستاویزی تاریخ تو تین ہزار سال پرانی ہے مگر ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک اس دھرتی کی تاریخ ایک لاکھ پچیس ہزار سال پرانی ہے، یہ انسان کا پہلا مسکن ہے، زمین پر اس کا اولین پڑاؤ۔

سری لنکا کو ایشیاء بھر میں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ پہلا ملک تھا جہاں کوئی خاتون حکمران بنی۔ یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی پچاس برس پہلے کا واقعہ ہے، جب انورادھاپورا نے لنکا کی زمام اقتدار سنبھالی تھی۔ صدارتی محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ شاہراہ اٹھارہ سال کی طویل بندش کے بعد گزشتہ مہینے عوام کی آمد و رفت کے لیے دوبارہ کھولی گئی ہے۔ رہائش گاہ کے اردگرد مسلح فوجی کمانڈو اپنی پوزیشنیں سنبھالے چاک و چوبند کھڑے ہر طرح کے دہشت گرد حملے سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ اٹھارہ سال پہلے لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام نامی تنظیم سے تعلق رکھنے والے ایک بمبار نے صدارتی محل پر خودکش حملہ کر دیا تھا۔ اس کے فوری ردعمل میں صدارتی محل کے سامنے واقع مرکزی شاہراہ کو عوام الناس کی آمدورفت کے لیے حفاظتی نقطہ نظر سے بند کر دیا گیا تھا۔ شہر کے نوآبادیاتی عہد میں تعمیر کیے گئے مرکز میں تین سو میٹر سڑک کے اس ٹکڑے کا کھلنا شہریوں کو آمدورفت کی سہولت سے زیادہ تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ ربع صدی تک جاری رہنے والی خانہ جنگی، جس میں ایک لاکھ انسانی جانوں کا زیاں ہوا اب ماضی بن چکی ہے، جسے لوگ جلد سے جلد بھلانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا، اکثریت سنہالی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو عموماً بدھ مت کی پیروکار ہے۔ حکومتی ایوانوں میں بھی انہی کا اثر و نفوذ زیادہ ہے۔ سری لنکا کی مقامی تامل آبادی اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تامل مجموعی طور پر ملکی آبادی کا تیرہ فیصد ہیں، یہ ہندو مذہب کے ماننے والے ہیں۔ سنہالی زبان کے بعد تامل دوسری بڑی زبان ہے۔ مسلمان کل آبادی کا دس فیصد ہیں، جو کہ ''مور'' اور ''ملایا'' نسل سے متعلق زیادہ ہیں۔ مسلمان اور عیسائی سنہالی و تامل نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اردو کا محاورہ ''چوروں کو پڑ گئے مور'' اسی مور نسل سے متعلق ہے۔ پنجاب میں نیلی بار اور جنوبی علاقوں میں بھی مور قبائل آباد ہیں جو زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بدھ مت ملکی آبادی کا ستر فیصد ہیں اور اسی باعث ملکی وسائل پر ان کا کنٹرول ہونا قابل فہم بات تو ہے مگر اقلیتی آبادی کے مسائل پر عدم توجہی نے ماضی میں بہت سارے مسائل کو جنم دیا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام نامی دہشت گرد تنظیم کی بنیاد یونیورسٹی میں کوٹہ سسٹم کے نفاذ کے ردعمل میں رکھی گئی۔ پھر جافنا کے علاقے میں تامل نسل میئر کے قتل نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان سری لنکا میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے تامل آبادی کو استعمال کیا اور انہیں ابتدا میں وسائل بھی فراہم کیے۔

خودکش حملہ آوروں کی تاریخ یوں تو زمانہ قبل از مسیح جتنی پرانی ہے مگر عہد جدید میں دوسری عالمی جنگ کے دوران جاپانی ہوابازوں نے جنہیں ''کھامی کھازی'' جس کا ترجمہ ''بادخدا'' یا پھر ''ملکوتی ہوا'' کیا جانا چاہیے، اس کی بنیاد رکھی۔ پھر تامل ٹائیگرز نے اسے شدت اور جدت سے ہمکنار کیا۔ یہ خودکش بمبار اگر اپنے مشن میں ناکام ہو جاتے تو اپنے گلے میں پہنا ہوا زہر کا کیپسول نگل جاتے تھے، تاکہ قانون نافذ کرنے والے کسی سرکاری ادارے کے ہاتھ نہ آ جائیں۔ بے شمار واقعات میں گرفتار ہوتے ہی ان جنگجوؤں نے زہر کا کیپسول نگل لیا اور جان دے دی۔ ان خودکش جنگجوؤں میں مرد و خواتین کی بھی تخصیص نہیں تھی۔ یاد رہے کہ سابق بھارتی وزیر راجیو گاندھی کو خودکش بم حملے میں ہلاک کرنے والی بھی ایک تامل ٹائیگرز کی رکن خاتون تھی۔ بھارت کے ساتھ تامل ٹائیگرز کو یہ گلہ ہے کہ اس نے دوغلی پالیسی اپنائی، پہلے اس تنظیم کو مدد دے کر مضبوط بناتا رہا پھر اسی تنظیم کے خاتمے کے لیے سری لنکا کی حکومت سے معاہدہ کر کے اپنی فوج بھیج دی۔ بنیادی طور پر انڈیا نے سری لنکا میں اپنا اثر و نفوذ

بڑھانے کے لیے اس تنظیم کو استعمال کیا تھا۔ ہندوستانی فوج سری لنکا میں امن قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی، بالآخر سری لنکا کی اپنی فوج نے ہی یہ مشکل جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئی۔

چند برس پہلے میری ملاقات کولمبیا کی باغی تنظیم فارس کی ایک خاتون رکن سے ملاقات ہوئی تھی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک سوشلسٹ انقلاب کے لیے عسکری جدوجہد کرنے والی یہ تنظیم گزشتہ برسوں میں مسلسل کمزور ہو رہی ہے۔ ''فورسا آرمادا ریوولوسیناریا کولمبایانا'' کی رکن سے ملاقات کا کوئی ایسا خاص واقعہ مت سمجھے، کولمبیا کی تمام تر دیہی آبادی ہی عملی طور پر فارس کی رکن ہے، جہاں جہاں شہری حدود ختم ہوتی ہے حکومت کی عملداری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے مذکورہ خاتون سے انقلابی تحریک کے روبہ زوال ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ''نیویارک میں 11 ستمبر 2001 کو پیش آنے والا واقعہ'' مجھے اس کا یہ جواب عجیب سا لگا، بھلا امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے اغواشدہ طیاروں کے ٹکرانے کا کولمبیا کے عسکریت پسندوں کے ساتھ کیا لینا دینا؟ میرے سوال کو غور سے سننے کے بعد گبریلا نامی یہ خاتون سنجیدگی سے بولی کہ 11 ستمبر کو پیش آنے والے دہشت گردی کے واقعے کے بعد دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سانحے کے رونما ہونے سے پیشتر امریکہ دنیا بھر میں انسانی حقوق کا علمبردار ہونے کا دعوے دار تھا۔ جیسے ہی کسی ملک کے عسکری ادارے اپنے شہریوں کے خلاف کسی قسم کی مسلح کارروائی شروع کرتے، تو امریکہ بہادر انسانی حقوق کی پامالی کا شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا، مگر 11 ستمبر کے بعد انسانی حقوق کا منتر پس منظر میں چلا گیا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ اولین ترجیح بن گئی۔ ایسے عالم میں فارس اور اس نوع کی دیگر تنظیموں کے خلاف ریاستی اداروں کی کارروائی کے لیے ماحول سازگار بن گیا۔ وہ امریکہ جو کبھی انسانی حقوق اور شخصی آزادیوں کا چیمپئن کہلانا پسند کرتا تھا، اب مسلح گروہوں کے خاتمے کے لیے شورش زدہ ممالک کو مالی و عسکری امداد دینے لگا ہے۔ میرے خیال میں تامل ٹائیگرز کے خاتمے کی دیگر وجوہات کے علاوہ امریکہ کا یہی بدلا ہوا رویہ بھی اہم وجہ ہے۔ سری لنکا میں خانہ جنگی کے آخری سال چالیس ہزار افراد سکیورٹی اداروں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے مگر اقوام متحدہ سمیت کہیں بھی کسی نے ان میں سے ماورائے عدالت قتل ہونے والوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

تامل ٹائیگرز کے خاتمے اور امن قائم کرنے میں پاکستانی فوج نے سری لنکن آرمی کی بہت مدد کی ہے۔ یہ بات مجھے ایک ذمہ دار شخص نے یہاں بتائی، تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں۔ دردِ مشترک تو یہ ہے کہ دونوں ممالک ہی اندرونی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہیں۔ تامل ٹائیگرز کو شکست دینے والے فاتح سابق صدر راجا پکسے صدارتی انتخاب ہار گئے۔ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ سری لنکا میں امن لیکر آئے ہیں۔ ایک دوکاندار نے مجھ سے کہا کہ راجا پکسے ہمارے بھگوان ہیں، مگر اب انہیں آرام کرنا چاہیے۔ ایک ستم ظریف نے تو یہ بھی کہا کہ اس نے کافی پیسے بنا لیے۔ اب کسی اور کو موقع دینا چاہیے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ لوگ خانہ جنگی کے عہد کو فراموش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پچھلے دنوں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں جنگ کے ہیرو جرنیل کی سیاسی جماعت نے بھی حصہ لیا مگر جنگ کا فاتح الیکشن میں بری طرح ہار گیا۔ سابق صدر کی پارٹی بھی بلدیاتی انتخاب میں شکست فاش سے دوچار ہوئی۔ اب ہر سیاسی لیڈر میں نیلسن منڈیلا جیسا ظرف اور حوصلہ کہاں ہوتا ہے، کہ اپنے اقتدار کے عروج اور سیاسی نقطہ کمال پر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر کے اقتدار عوام کے دیگر نمائندوں کے سپرد کر دے۔ اور پھر سیاست میں مداخلت بھی نہ کرے۔ تیسری دنیا کے سیاسی قائدین کا المیہ ہے کہ جب تک جوتے یا گندے انڈے ان کے سر پر نہ پڑیں، انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں میں اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں۔ سری لنکا میں صدارتی نظام حکومت ہے۔ صدر پانچ سال کے لیے منتخب ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ اس عہدے پر براجمان رہ سکتا ہے۔

میں جس جگہ بیٹھا یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، نوآبادیاتی عہد کے تعمیر کردہ بنگلوں کے جھرمٹ پر مشتمل اس علاقے کو ہوٹل کہتے ہوئے جھجک محسوس کر رہا ہوں۔ مگر چونکہ عارضی قیام کی رہائش گاہ کے لیے ہوٹل کا لفظ ہی مستعمل ہے، اس لیے کولمبو کے ترلمین بنگلوز کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے۔ یہاں دو، تین اور چار بنگلوں کے مختلف سیٹ بنے ہوئے ہیں۔ بڑا سا لونگ روم، ماسٹر بیڈروم اور باتھ روم، سب کچھ بہت ہی کشادہ ہے اور ان میں سجی کرسیاں تو اسے شاہی رنگ و روپ دے رہی ہے۔ سینکڑوں ایکڑ اراضی پر پھیلے اس ہرے بھرے رقبے میں کوئی بھی عمارت کثیر منزلہ نہیں، سب یک منزلہ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ میرے آگے پیچھے بنگلوں میں جرمن جوڑے اقامت پذیر ہیں۔ استقبالیہ پر بھی جرمنی سے آئے ہوئے سیاحوں کو اپنی اپنی باری کا منتظر پایا اور سوئمنگ پول پر بھی جرمنوں کا راج تھا۔ ان کے بعد دوسرے درجے پر بات کریں تو عرب سیاح بھی کثیر تعداد میں اس ملک کا رخ کرتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ جرمن اور عرب اس سرزمین پر طویل عرصے تک حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ کولمبو کا ڈچ ہسپتال اسی نوآبادیاتی عہد کی یادگار ہے۔ اسپتال تو یہ اب

صرف نام کا ہے، آجکل یہ ایک مقبول سیاحتی مرکز میں تبدیل ہو چکا ہے، یہاں پر کثیر تعداد میں انواع اقسام کے ریستوران دن بھر اور میکدے شب بھر سیاحوں کا دل بہلاتے ہیں۔

میں حیرت اور اسرار سے اتنی بڑی تعداد میں جاپانیوں کی اس دیس میں سیاحت کی غرض سے آمد کا سبب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اب تو پھر بھی امن کا دور دورہ ہے، خانہ جنگی کے طویل عرصے کے دوران بھی اہل جاپان کافی بڑی تعداد میں یہاں آتے جاتے رہے۔ یہ بات حیرت انگیز اس لیے ہے کہ جاپانی امن پسند اور امن پسندی کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ جنگ زدہ علاقوں سے بھی دور بھاگتے ہیں،

حد درجہ احتیاط پسند واقع ہوئے ہیں۔ زبان مختلف، ثقافت بالکل الگ طرز کی، اس کے باوجود سری لنکا کے علاوہ فقط تھائی لینڈ میں جاپانی اتنی کثیر تعداد میں دیکھے ہیں۔ ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے، غالباً بدھ مت وہ مشترک ورثہ اور شناخت ہے جو ان دونوں ملکوں میں قربت کا سبب لگتا ہے۔ بھوٹان سے قربت کی بھی غالباً یہی وجہ ہے۔ شاید مذہب اور مشترکہ تاریخ غیر محسوس طریقے سے قوموں کے درمیان غیر مرئی رشتہ قائم کر دیتی ہے۔ مشترکہ مذہب اور مشترکہ تاریخ میری نظر میں مشترکہ زبان اور ثقافت جتنی ہی اہم چیزیں ہیں جو مختلف اقوام کے ایک دوسرے کے قریب لانے کا موجب بنتی ہیں۔

سری لنکا کی بدھ مت شناخت اور ورثے کے لحاظ سے یہ چیز قابل ذکر ہے کہ جیسا پہلے عرض کیا مہاتما بدھ کی تعلیمات کو کتابی شکل پہلی مرتبہ اسی جزیرے پر دی گئی تھی۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ گوتم بدھ کے افکار و ارشادات کو ضبط تحریر میں پہلی مرتبہ اسی دیس میں لایا گیا تھا۔ یہ واقع انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل اور طویل بھی ہے۔ مختصر طور پر بیان کروں تو حضرت عیسیٰ کی فلسطین میں پیدائش سے پچیس برس پیشتر اسی لنکا میں چوتھا عالمی بدھ مت اجلاس ہوا تھا، اسی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ بدھا کے افکار کو ضبط تحریر میں لایا جائے گا۔ اس سے قبل مہاتما بدھ کی تعلیمات سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو بدھ بھکشو منتقل کرتے تھے۔ قدرتی آفات و وباؤں کے سبب بہت سارے جید بھکشوؤں کی پے در پے موت سے بدھ کی تعلیمات جنہیں ''پالی اصول'' کہا جاتا ہے، ناپید ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک بار جب قحط سالی کے سبب بہت سارے نامور بدھ بھکشو دنیا سے رخصت ہوئے تو بچ جانے والے بھکشوؤں نے فنا کے خطرے کو بھانپتے ہوئے، انہیں درختوں کے پتوں، چھلکوں، اور جانوروں کے کھالوں کے علاوہ پتھروں پر کندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ابتدا میں یہاں ناریل کے پتے گوتم بدھ کی تعلیمات کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوئے۔ انہی پتوں پر تحریر کردہ سدھارتھ، جو بدھا بن گیا، کی تعلیمات تھائی لینڈ، برما، کمبوڈیا اور لاؤس پہنچی تھی۔ جہاں لوگوں نے ان افکار کو پسند کرتے ہوئے بدھ دھرم اختیار کرنا شروع کر دیا۔

سری لنکا کی چائے اس کی عالمی سطح پر شناخت کا حصہ ہونے کے علاوہ زرمبادلہ کا اہم ذریعہ بھی ہے۔ ملک کا نام سرکاری سطح پر تبدیل کر کے سیلون سے سری لنکا رکھنے کے باوجود چائے کی فروخت کے لیے پرانا نام سیلون ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ سیلون چائے کی پیداوار، اس کے باغات اور عالمی سطح پر اس کی مقبولیت برطانوی نوآبادیاتی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اب بھی ملک کا سب سے مقبول چائے کا برانڈ ''سیلون انگلش ٹی'' ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہاں برطانوی نوآبادیاتی عہد کو لوگ برا نہیں کہتے، بلکہ بے حد پسند کرتے ہیں۔ عمومی طور پر اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ملک میں کئی روزنامہ اخبار انگریزی زبان میں چھپتے ہیں۔ مقامی آبادی کی سب سے بڑی زبان تو سنہالی اور پھر تامل ہے مگر سب سے کثیر الاشاعت اخبار انگریزی زبان میں چھپتا ہے۔

سری لنکا غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کا رکن ہونے کے علاوہ، جنوبی ایشیاء کے ممالک کی تنظیم ''سارک'' اور دولت مشترکہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سارک ممالک میں عمومی اشتراک تاج برطانیہ کی سو سالہ غلامی ہے، یہی وہ درد مشترک ہے جو ہمیں قریب لے آتا ہے۔ دولت مشترکہ بھی انگلستان کے زیر نگیں رہنے والے ممالک کے اجتماعی پلیٹ فارم سے زیادہ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ زراعت کا شعبہ، جس میں چائے اور مصالحہ جات کی برآمد نمایاں ہے، اور سیاحت وہ دوسرا ستون ہے جس پر ملک کی معاشی عمارت کھڑی ہے۔ اگرچہ صنعتی اور مالیاتی شعبہ جات میں بھی نمایاں ترقی دیکھی جا رہی ہے مگر معیشت کی ریڑھ کی ہڈی زراعت اور سیاحت کا شعبہ ہے۔

کولمبو اپنے محل وقوع اور موسم کے اعتبار سے کراچی سے ملتا جلتا ہے، آبادی نسبتاً کم ہے۔ یعنی سائٹھ لاکھ نفوس شہر کا پھیلاؤ کافی زیادہ ہے مگر بھیڑ کا عالم ویسا نہیں جیسے کراچی اور لاہور میں ہوتا ہے۔ شہر سے ائیر پورٹ آدھ گھنٹے کی مسافت پر ہے، اگر آٹو رکشہ لے لیں تو پھر بھی ایک گھنٹے میں باآسانی پہنچ جائیں گے۔

❁❁❁

شاعری

بچھڑ کے تجھ سے بڑی ابتلا میں رہتے ہیں
کہ جیسے ہم بھی کسی کربلا میں رہتے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ اسی میں تری بھلائی ہے
ہم اہلِ عشق ہیں، اپنی ہوا میں رہتے ہیں
خیال و خواب سے اہلِ سخن نکلتے نہیں
زمیں پہ رہتے ہوئے بھی خلا میں رہتے ہیں
عقیق و لعل و جواہر سے کم نہیں ہرگز
جو سنگ ریزے تری گردِ پا میں رہتے ہیں
فسانہ ہائے محبت کے سارے شہزادے
سنا ہے آج بھی کوہِ ندا میں رہتے ہیں
حضور! تختِ سلیماں تمہیں مبارک ہو
ہم اہلِ عشق تو شہر "سبا" میں رہتے ہیں
جو رہگذارِ فنا سے ہیں باخبر خورشید
تمام عمر تلاشِ بقا میں رہتے ہیں

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

جو آفتوں کے تناظر سے کٹ کے دیکھتے ہیں
وہ زندگی کو زمانے سے ہٹ کے دیکھتے ہیں
پہنچنا ہو جنہیں بروقت اپنی منزل پر
سفر میں کب وہ کسی کو پلٹ کے دیکھتے ہیں
عجب نہیں کوئی عرفاں ہمیں بھی مل جائے
کسی درخت سے ہم بھی لپٹ کے دیکھتے ہیں
وہ کیا بنائیں گے دُنیا میں اپنا مستقبل
جو اپنے حال کو ماضی سے کٹ کے دیکھتے ہیں
لکھا ہوا ہے جہاں لا تفرقوا راشد
ہم اُس کتاب کو فرقوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ کوئی دیکھتا نہیں راشد
ہم اُس کے پھول سے چہرے کو ڈٹ کے دیکھتے ہیں

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

جب سے اُس حسنِ قبا سوز نے عریانی کی
چلمنیں تان کے بیٹھا ہوں میں حیرانی کی
یوں تو مشکل تھی بہت راہ غزل خوانی کی
وہ تو کہیے کہ کسی یاد نے آسانی کی
میں نے روٹھے ہوئے یاروں سے تعلق رکھا
میں نے اُجڑے ہوئے باغوں کی نگہبانی کی
عشق وہ ظرف جو آپ اپنی انا سے پر ہے
اس میں حسرت کی جگہ ہے نہ پشیمانی کی
میرے سوکھے ہوئے کوزوں کو نہ پھینکے کوئی
ان سے آتی ہے مجھے اب بھی مہک پانی کی
اتنا سوچا کہ اُتر جائیں گی اُس کی یادیں
دیکھتے دیکھتے اک موج نے طغیانی کی
ایک بار اور اُڑا دو مرا ذرہ ذرہ
میں نے پھر خاک سمیٹی ہے پریشانی کی

میجر شہزاد نیر/گوجرانوالہ

چمن چمن میں جو رنگ و بو ہے سبب تمہی ہو
یہ کیف و مستی جو کو بہ کو ہے سبب تمہی ہو
تمہارا آنچل اُڑا ہوا میں تو رنگ بکھرے
یہ روشنی سی جو چار سُو ہے سبب تمہی ہو
زمین جانے زمانہ جانے فلک بھی جانے
جنون میرا جو سرخرو ہے سبب تمہی ہو
ہر ایک عضوِ بدن تمہارا غزل ہے جاناں
مرے ہنر کی جو آبرو ہے سبب تمہی ہو
چراغ مدھم فضا میں تلخی نصیب دشمن
جو گرم پھر بھی مرا لہو ہے سبب تمہی ہو
تمہاری خاطر ٹھہر گیا ہے سفر سے جو
ہر ایک لمحہ جو باوضو ہے سبب تمہی ہو
میں سچ کہوں تو کمال میرا نہیں ہے شاہد
جو میری دنیا کو جستجو ہے سبب تمہی ہو

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

میرے ہمراہ رہ کر بھی میرے ہمراہ نہیں ہے
وہ منزل ہے کہ جس کا کوئی بھی رستہ نہیں ہے
وہ اک نازک تعلق کو سمجھ بیٹھا ہے رشتہ
یہ اک ریشم کی ڈوری ہے کوئی رشتہ نہیں ہے
محبت کو نیا تعارف نیا اک نام دے کر
ہمیں بس یاد رکھتا ہے کبھی ملتا نہیں ہے
سنو! ہے لاش دفنانے کو ہاتھوں کی ضرورت
کبھی تنہا یہ جیون کا سفر کٹتا نہیں ہے
عجیب سا دھندلکا ہے ذات کی بارہ دری میں
سحر کے بعد بھی منظر ترا کھلتا نہیں ہے
خزاں کی چاپ بھی چپ چاپ بیٹھی ہے یہاں پر
خزاں کی لال آندھی میں کوئی پتا نہیں ہے

آسناتھ کنول/لاہور

کہکشاؤں پہ نہ افلاک پہ دن گزرے ہیں
میں تو مٹی ہوں مرے خاک پہ دن گزرے ہیں

ایک لمحے میں مجھے توڑ دیا ہے تو نے
کتنی مشکل سے مرے چاک پہ دن گزرے ہیں
ڈھونڈنے والے تو تھک ہار گئے، اپنے مگر
عشق میں جادۂ چالاک پہ دن گزرے ہیں
بے بصر ملتے رہے آ کے تجھے خلوت میں
لالۂ حسن کے خاشاک پہ دن گزرے ہیں
یہ جواب ایک طرف خشک پڑا ہے جاناں
اس گھڑے کے بھی کبھی "ڈھاک" پہ دن گزرے ہیں
وسوسے ڈستے رہے عشق میں سانپوں کی طرح
بے عصا راہِ خطرناک پہ دن گزرتے ہیں
آگہی روندی گئی دشتِ قناعت میں اسد
تیز رو توسنِ ادراک پہ دن گزرے ہیں

اسد اعوان/سرگودھا

کچھ کم نگاہ لوگ مرے آس پاس ہیں
یعنی تباہ لوگ مرے آس پاس ہیں
وہ مل گیا ہے جس کے لیے تھا میں دربدر
اب خوامخواہ لوگ مرے آس پاس ہیں
جی چاہتا ہے تجھ سے اکیلے میں بات ہو
اور بے پناہ لوگ مرے آس پاس ہیں
محسوس کر رہا ہوں میں خود کو بہت بڑا
وہ بادشاہ لوگ مرے آس پاس ہیں
میں قہقہوں میں گوندھا ہوا ایک شخص ہوں
اور مثلِ آہ لوگ مرے آس پاس ہیں
شہباز اُس نے آنکھ سے مجھ کو دیا پیام
عالم پناہ! لوگ مرے آس پاس ہیں

شہباز نیرّ/رحیم یار خان

جذبِ شبِ وصال کے موسم نہیں رہے
اب شام میں کمال کے موسم نہیں رہے
اب محفلِ نشاط سے بھی دور بھاگ جا
اب تو ترے خیال کے موسم نہیں رہے
ہم بھی دیارِ یار کی گلیوں میں کھو گئے
تیرے بھی وہ جلال کے موسم نہیں رہے
ہم نے تری جدائی بھی ہنس کر گزار دی
ہم پر کبھی زوال کے موسم نہیں رہے
غمگین سے یہ پھول بھی جو کھلکھلا اُٹھے
شاید ترے جمال کے موسم نہیں رہے
اب شاعروں نے شاعری کو کیا بنا دیا
جاذب ترے کمال کے موسم نہیں رہے

امان اللہ جاذب/لاہور

کیا عطا ہونے کو ہے خوشبو کی سلطانی مجھے
لوریاں دیتی ہے اکثر رات کی رانی مجھے
خیر جتنی بھی ملی تھی گھر تلک پہنچی نہیں
مار ڈالے گی یہ اپنی چاک دامانی مجھے
جھوٹ کاگا بولتا تھا سارا دن ہی بام پر
میں یہ سمجھا تھا ملے گی تیری مہمانی مجھے
شاعروں کی سوچ جیسی قیمتی لڑکی ہے وہ
اس کے جذبوں کی ہے مالا خود کو پہنانی مجھے
روز ماں جی چومتی ہیں کتنے نازوں سے اسے
اپنی سورج کی طرح لگتی ہے پیشانی مجھے
پیاس جب بھی یاد آتی ہے علیؑ اصغر تری
زہر لگتا ہے کبھی دریاؤں کا پانی مجھے
ہوک پھر اٹھتی ہے عابدؔ دل کے سونے گاؤں سے
جب بھی آوازیں دیا کرتی ہے ویرانی مجھے

رائے عابد علی/شیخوپورہ

یونہی تو میں اب شہرِ ستمگر نہیں آتا
اب خواب میں وہ حسن کا پیکر نہیں آتا
ممکن ہے ثمر بار ہو آنگن کا شجر بھی
ایسے تو کوئی صحن میں پتھر نہیں آتا
آ جاتا تھا پہلے تو تری یاد کا لشکر
مدت سے تری یاد کا لشکر نہیں آتا
پیش آتا ہے پہلے سے کوئی حادثہ دل کو
ایسے تو ان آنکھوں میں سمندر نہیں آتا
آتا ہے تو لے جاتا ہے چپ چاپ بہا کر
سیلاب کسی کو بھی بتا کر نہیں آتا
کیسے وہ پڑھا پائے گا اسکول میں بچے
جس شخص کو آٹا بھی میسر نہیں آتا
کھا جائے گا تنہائی کا آزار مجھے بھی
یہ سوچ کے میں شام ڈھلے گھر نہیں آتا

راؤ وحید اسد/ملتان

مسافر سب چلے جائیں مگر تنہا نہیں ہوتے
پرندے اُڑ بھی جائیں تو شجر تنہا نہیں ہوتے
اگر مخلص رہے دو دل محبت میں یقیں جانو
بظاہر دور رہتے ہیں مگر تنہا نہیں ہوتے
مجھے جانا ہے کچھ پل کے لیے پھر لوٹ آؤں گا
کسی کے یوں چلے جانے سے گھر تنہا نہیں ہوتے
کوئی مشکل نہیں آتی پریشانی نہیں ہوتی
خدا کی ساتھ رحمت ہو بشر تنہا نہیں ہوتے
سدا رہتے ہیں جو ساگر محبت کے اُجالوں میں
اِدھر تنہا نہیں ہوتا اُدھر تنہا نہیں ہوتے

صدام ساگر/گوجرانوالہ

تماشا شوق سے یہ بار بار کرتے ہیں
مرے کرم پہ ستم اختیار کرتے ہیں
ترنم اُن کی صدا میں ادا میں شوخی ہے
مرے الم کو شگفتہ بہار کرتے ہیں

سبب جو ترکِ تعلق کا پوچھتا ہوں میں
ادا خموشی کی وہ اختیار کرتے ہیں
کہ اُن کی شوخیِ ستم گر ہے اس طرح ہم پر
کہ وقتِ وصل بھی دل بے قرار کرتے ہیں
ترے لباس میں گُل ہائے رنگ رنگ کے ساز
صبا کے دوش پہ لطف ہزار کرتے ہیں
پھرے ہیں چاک گریبان کر کے فرقت میں
نگاہ و قلب و جگر پر ہی وار کرتے ہیں
جو دن گزرتا ہے مسعودؔ یاد سے غافل
ہم اُس کو رات میں اپنی شمار کرتے ہیں

خالد مسعود/ لاہور

راستوں کو غبار کرتے ہیں
ہم تو منزل سے پیار کرتے ہیں
صحنِ گلشن کو اپنی خوشبو سے
روز وہ مُشکبار کرتے ہیں
تیرے وعدے پہ ہے یقیں ہم کو
آنکھ پر اعتبار کرتے ہیں
میرے آنگن میں وہ کبھی آئیں
زینتِ صد ہزار کرتے ہیں
میری حسرت کا تجھ کو ہے معلوم
جلووں کا انتظار کرتے ہیں
اُن کی ہاں جانیے نفی کا نشاں
گر نفی بار بار کرتے ہیں
کاش اُن کو بھی ساتھ لے آتے
چارہ گر بے قرار کرتے ہیں
کاکلِ افشاں ہیں ان کے چہرے پر
چشمِ دل بے قرار کرتے ہیں

خالد مسعود/ لاہور

اپنی پسند چھوڑ دی اس کی خرید لی
ورثے کا کھیت بیچ کے کوٹھی خرید لی
ویسے تو نرخ کم ہی تھے گندم کے اس برس
آئی تھی تیرے گاؤں سے مہنگی خرید لی
اے ہجر زاد تم کو بھی ہے آرزوئے وصل
اے دشت زاد تم نے بھی کشتی خرید لی
شاعر کو اپنے شعر بھی بچے بھی تھے عزیز
پھر اس نے شعر بیچ کے روٹی خرید لی
دراصل مسئلہ تو ہے چلنا گھڑی کے ساتھ
اس سے غرض نہیں ہے کہ کیسی خرید لی

پارس مزاری

نظمیں

دُعا

میرے جذبوں کو پذیرائی دے
میری سوچوں کو توانائی دے
میرے افکار کو اے ربِ قدیر
حُسنِ تخلیق کی رعنائی دے
آئینے میں جو تجھے دیکھ سکے
مجھ کو وہ چشمِ تماشائی دے
بے نمازوں میں نہ ہو میرا شمار
تو مجھے شوقِ جبیں سائی دے
حق پرستوں سے تعلق ہو مرا
دردمندوں سے شناسائی دے
خدمتِ شاہ سے بہتر ہے مجھے
خدمتِ خلق کی دارائی دے
کورِ باطن کو بصیرت ہو عطا
دیدہ کور کو بینائی دے
غولِ ناداں ہے یہ انبوہِ کثیر
ناسمجھ ہیں انہیں دانائی دے
مجھ کو توفیقِ عمل دے یارب
حسن دے خیر دے سچائی دے

مظفر حسن منصور/ خوشاب

اقبال کا شاہین گرفتارِ بلا ہے

اک ناقد مغرب نے بصد طنز کہا ہے
اقبال کا شاہین گرفتارِ بلا ہے

کرنا تھا جسے جا کے بلندی پہ بسیرا
اُس مردِ قلندر کا ہے فٹ پاتھ پہ ڈیرا
یہ وہ ہے جسے ڈھونڈتا پھرتا ہے سویرا
ہر سمت سے طوفانِ مصائب نے ہے گھیرا
کشکولِ گدائی لیے رستے میں کھڑا ہے
اقبال کا شاہین گرفتارِ بلا ہے

تفریح کا سامان ہے میدانِ سیاست
ہر صاحبِ زر کرتا ہے اعلانِ سیاست
ابلیس کے دم ساز ہیں ارکانِ سیاست
ہے دھندہ کمائی کا بعنوانِ سیاست
اس نام کے درویش کی صد چاک قبا ہے
اقبال کا شاہین گرفتارِ بلا ہے

ہر شخص دو رنگی کا شکار ازلی ہے
تعلیم کا فقدان ہے بے خبری ہے
خودکش وہ جرائم ہیں کہ بس چپ ہی بھلی ہے
غم دیدہ نظر خانہ کعبہ پہ جمی ہے
ہاتھ آؤ اُٹھائیں کہ یہی وقت دعا ہے

سعید پسروری/ لاہور

بقیہ انٹرویو ڈاکٹر اختر شمار

سارا ملتان گواہ ہے کہ اس نوجوان کی شعری تربیت کس نے کی۔ اسے سکول کی پہلی کلاس میں انگلی پکڑ کر داخل میں نے کرایا، وہ جو چوتھی کلاس سے بھاگا ہوا تھا اپنے ہیڈ ماسٹر دوست سے کہہ کر اسے نئے سرے سے پہلی جماعت میں داخل کرایا، اسے شاعری کی سدھ بدھ سکھائی، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر، نوازش ندیم شفیق آصف سے لے کر ناصر بشیر تک سبھی ماشاء اللہ حیات ہیں اور سب گواہ ہیں کہ اسے کس طرح تعلیم و تربیت دی۔ محلے دار ہونے کے سبب، اس کی ہر طرح کی مدد بھی کی، محلے دار سبھی کچھ جانتے ہیں، میں اسے لے کر بیدل صاحب کے پاس بھی جایا کرتا۔ اسی دوران بیدل صاحب نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ وہ ان کے ہاں آنے جانے لگا، اصلاح بھی لیتا رہا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آخر کار اس نے بیدل صاحب ہی کو ڈس لیا۔ انہوں نے بھگا دیا۔ اب وہ ہر پل نہ صرف یہ کہ بیدل صاحب بلکہ مجھے بھی یاد کرتا رہتا ہے۔ بیدل صاحب کی سب ڈائریاں ان کے گھر والوں کے پاس موجود ہیں، ان کا کوئی مجموعہ لے کر کہاں بھاگ سکتا ہے۔ پھر میرا کون سا اشاعتی ادارہ تھا کہ ان سے مجموعہ لے کر آتا اور پھر دبا کر بیٹھ جاتا۔ اب تو ان کے سارے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کی تدوین بھی ہو چکی ہے بلکہ کل کلام کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ کلیات بھی خود ان کے جانشین شکیل سروش نے چھپوا دیا ہے۔ لہٰذا یہ انتہائی لغو بات ہے کہ بیدل صاحب کا کوئی غیر مطبوعہ کلام کسی کے پاس ہے۔ مجھے کوئی متشاعر کہتا پھرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر جب بیدل صاحب کی صاحبزادی کے حوالے سے وہ بدبخت بے سروپا باتیں کرتا ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے۔ مجھے یقین ہے ایک دن وہ اس سارے پروپیگنڈے پر پشیمان ضرور ہوگا کہ میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا۔ میں اس کی ساری کوتاہیوں کو ہمیشہ کے لئے معاف کرتا ہوں۔

س: پانچ برس ملک سے باہر، ادبی حلقوں سے دور (مصر میں) تجربہ کیسا رہا اور اس کے آپ کے ادبی کیریئر اور ذات پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج: وطن سے دوری کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ والدین، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور احباب کو انسان Miss کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے انسان اپنے مسائل اور مجبوریوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے کبھی تعلیم اور کبھی رزق کے معاملات میں سفر بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ ایک اعزاز تھا کہ میں اردو چیئر پر منتخب ہوا۔ بیرون ملک یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کیریئر میں اس کی اپنی اہمیت بھی ہے۔ اس سے معاشی طور پر بھی قدرے تبدیلی آتی ہے۔ میں نے ان برسوں میں جمع پونجی سے لاہور میں اپنے لیے ایک 'چھت' کا بندوبست کیا، بچوں کی تعلیم تربیت میں بھی بہتری آئی۔ اس کے علاوہ وطن سے دور رہ کر وطن سے محبت کے جذبے بھی تقویت اختیار کرتے ہیں۔ میں نے بیرون ملک قدرے تنہائی سے ایک اور فائدہ بھی حاصل کیا۔ یعنی خود احتسابی اور ذات و حیات پر غور و فکر کے لمحوں سے اپنی تطہیر پر بھی توجہ دی۔

اگرچہ ایف سی کالج یونیورسٹی میں آنے کے بعد وہ 'بجنگ آمد' کا اداراتی رویہ خود سے منہا کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر مصر میں مطالعے اور تفکر نے مجھے انسان کی اصل تک رسائی حاصل کرنے کے راستے پر ڈال دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر پر توجہ دینی چاہیے۔ اس میں شخصیت کی باطنی صحت و شفافیت کو خاص طور پر مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مصر میں رہ کر اپنے طاب علموں اور خاص طور پر نوجوان قارئین کے لیے ایک مختصر سی کتاب ''آدابِ خود آگاہی'' بھی تیار کی۔ اب اس سے آگے کا سفر جاری ہے اور آنے والے دنوں میں انسان کی پریشانیوں سے نجات کے حولے سے میری کتاب آنے والی ہے۔ جس میں تصوف کے حوالے سے آج کے انسان کی بے چینی کا کسی حد تک حل تلاش کرنے کی کوشش شامل ہے۔ آج اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ایک عجیب افراتفری، بے سکونی، حرص و ہوس کا دور دورہ ہے۔ معاشی مسائل بھی اپنی جگہ ہیں۔ نظام کی خرابیاں اور ناانصافیاں بھی ہیں مگر ان مسائل پر تفکر اور تدبر سے قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہم میں برداشت کیوں کم ہوگئی ہے۔ انسانوں میں رواداری محبت اور اخوت ناپید کیوں ہو رہی ہے؟ ان ایشوز پر غور و فکر کی ضرورت ہے، مگر بدقسمتی سے دانشور بھی، جنھیں اپنے کردار اور تحریر و تقریر سے لوگوں کو ''ایجوکیٹ'' کرنا تھا۔ وہ بھی زندگی کی حقیقت سے دور نکل چکے ہیں اور اسی زندگی کی آسودگی کو سب کچھ سمجھ کر اپنے آپ کو ''خوشحال'' کرنے کے لیے ہانپتے کانپتے نظر آتے ہیں۔

س: اس تناظر میں ادیب، شاعر کہاں کھڑے ہیں؟

میں نے کہا نا آج ہر شخص جلدی میں ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اس ''میں'' نے ہمیں دانش سے دور کر دیا ہے۔

ہمارے سماج میں ادب کو کارِ فضول سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص اولاد میں سے کسی کو ادیب شاعر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہمارا سارا دھیان صرف اور صرف بہترین ''ملازمت'' کے لیے اپنے آپ کو تیا

رکرنا ہے۔ ہماری درس گاہوں میں بھی اچھے کیریئر کے لیے ایسے ہی مضامین میں ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ جاری ہے۔ کسی زمانے میں والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر انجینئر بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سے بے روزگار ڈاکٹروں کی کھیپ تیار ہوئی۔ آج کل آئی ٹی کے گریجویٹس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں ہیومینیٹیز کے شعبوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ سائنس کے شعبے میں تنخواہیں اور مراعات زیادہ ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا صرف سائنس اور ٹیکنالوجی سے انسان سچی خوشی اور طمانیت حاصل کر سکتا ہے۔ رات دن مشینوں سے وابستگی نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے جبکہ ہمارے قومی شاعر کہتے ہیں:
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت ایسے ماحول میں انسان، انسان سے کٹ گیا ہے۔ ایک عجیب سا "مفاداتی کلچر" تشکیل پا رہا ہے۔ سوشل میڈیا خاص کر الیکٹرانک میڈیا نے ہماری زندگی پر خاص اثرات مرتب کیے۔

کتاب کلچر ناپید ہو رہا ہے۔ اس سے انسانی دل و دماغ متاثر ہو رہا ہے۔ جسمانی اور روحانی صحت تباہ ہو رہی ہے۔ ہم میں آسائش اور آسودگی کے لیے ایک بھاگ دوڑ جاری ہے۔ ہر شخص راتوں رات دولت مند بننے کی فکر میں ہانپ رہا ہے۔ دولت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر بہت سے دولت مند اپنی صحت کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ انھیں سو طرح کے امراض، خدشات اور خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ نیند جیسی نعمت کے لیے بھی انھیں دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حقیقی سکون اور خوشی صرف دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ دولت سے اچھا بیڈروم تیار ہو سکتا ہے نیند اور سکون نہیں خریدا جا سکتا۔

س: دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا سماجی منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں سادگی، قناعت اور محبت اخوت ختم ہو رہی ہے۔ لوگ سادہ غذا کے عادی تھے۔ مرغی گھروں میں کبھی کبھار پکائی جاتی وہ بھی کسی مہمان کے آنے پر۔ مرغی کی اس ترکاری میں ذائقہ بھی ہوتا تھا۔ آج ہر گھر کی فریج میں برائلر کے پیکٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، جب دل چاہا نکال کر استعمال کر لیا۔ گوشت خوری کی عادت میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے۔

اور خالص گوشت کا تصور ماند پڑتا جا رہا ہے۔ مردہ جانوروں کے گوشت اور اس کی چربی سے کھانے کا تیل بنایا جاتا ہے۔ برائلر مرغیوں کی خوراک میں بھی مردہ جانوروں کی آنتیں الائشیں استعمال ہوتی ہیں۔ بیکری، مٹھائیوں میں کیمیکل ملا دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ خالص پانی تک نایاب ہو رہا ہے۔ ایسی دو نمبر خوراک سے انسان کی صحت کیا کرے گی؟ بیماریوں میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن دواؤں میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ بندہ کہاں جائے؟ نئی نسل کا "آئی کیو" متاثر ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خوراک کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ جیسا ہم کھاتے پیتے ہیں ویسی ہی ہماری سوچ پنپتی ہے۔ یوں سمجھ لیں: بندے ڈنگر ہوندے جاندے نیں۔

س: ۲۰۱۸ء کے حوالے سے آپ نے کوئی ادبی منصوبہ بندی کی ہے؟

ج: منصوبے تو ذہن میں بہت سے ہیں، لیکن اصل معاملہ ان کی تکمیل ہے، انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے، بہرحال ارادے تو ہوا کرتے ہیں، آنے والے دنوں میں میری دو کتب تو سمجھیں پبلشرز کے پاس ہیں جن میں ایک کتاب مرحوم شعراء ادباء کے حوالے سے "خاکے" ہیں۔ میرے روزنامہ نئی بات میں شائع ہونے والے کالموں کا انتخاب بھی شائع ہونے والا ہے۔ یہ کالم خاص طور پر متصوفانہ انداز لیے ہوئے ہیں اور ان میں درویشوں، ملنگوں کے ساتھ گزرے حالات واقعات ہیں۔

میرا تازہ شعری مجموعہ نعتیہ آہنگ میں میں لکھی گئی غزلیات پر مبنی ہے جو اس برس انشاء اللہ ضرور قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ویسے میں ذاتی طور پر نثر کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔

س: کیا نثری تحریروں کے ذریعے آپ لوگوں کی تربیت کا منصوبہ رکھتے ہیں؟

ج: کسی حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری نثری تحریروں میں نئی نسل کو سکون سے زندگی گزارنے کے ڈھب بیان کرنے کی کوشش ہے۔ مقصدیت سے عاری تحریر وقت کا ضیاع ہے۔ میں اپنے طالب علموں اور نوجوان قارئین کی تربیت کے بارے میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر نوجوانوں کی باطنی صحت کردار اور شخصیت سازی پر توجہ دینے کا ارادہ ہے۔

س: اس سلسلے میں آپ نے ڈرامے جیسے میڈیم کا سہارا کیوں نہیں لیا؟ کسی زمانے میں آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی تو لکھے تھے؟

ج: ہاں وقت ملا اور کوئی مناسب اور ذہین پروڈیوسر میسر آیا تو میں ڈرامہ ضرور لکھوں گا۔ اس حوالے سے میرے پاس چند اچھوتے آئیڈیاز موجود ہیں۔ ٹی وی ڈرامے جیسا میڈیم یکسانیت کا شکار ہے۔ عہد حاضر میں عملی تصوف سے لوگوں کی ذہنی قلبی اور روحانی تربیت ڈراموں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس کے اثرات بھی گہرے ہیں، ٹیلی ویژن کی ہمارے ہاں بیڈروم تک رسائی ہے اس سے لوگوں میں فکر و شعور عام کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

س: ڈرامہ سے ہمارے معاشرے پر اور زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

ج: اس وقت ہمارا ڈرامہ نئی نسل کو بگاڑنے میں مدد

معاون ثابت ہو رہا ہے۔، نوجوان جو کچھ دیکھتے ہیں اثر لیتے ہیں، زبان عادات رسم ورواج سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ اخلاقیات پر قطعی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ہر کہانی ٹیلی ویژن پر نہیں دکھائی جا سکتی۔ معاشرے کو مثالی بنانے کے لیے منفی کرداروں کی بجائے مثبت کہانیوں اور کرداروں کو رواج ملنا ضروری ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے اشتہار تک بے تکے غیر سنجیدہ اور مضحکہ خیز بنائے جانے لگے ہیں۔ اس پر کوئی توجہ دینے والا نہیں۔۔۔۔ اب دیکھیں ناں ''داغ تو اچھے ہوتے ہیں'' جیسا جملہ نئی نسل پر کیا اثرات مرتب کرے گا، بھلا داغ اچھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ واشنگ پوڈر کی طرف مائل کرنے کے لیے کوئی اور مکالمہ بھی تو تحریر کر سکتے ہیں۔ ڈراموں میں ماں کو یار کہہ کر مخاطب کرنا کہاں کی روشن خیالی ہے؟

س: دانشور اور تخلیق کار کی آواز موثر کیوں نہیں رہی؟ آپ کی رائے؟

ج: آج دانشور بھی میڈیا 'پرسن' کو ہی سمجھا جانے لگا ہے۔ جو کوئی چند دن سکرین پر نظر آنے لگتا ہے، خیر سے، دانشوروں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ صحافت میں ادیب شاعر بھی ہوتے ہیں مگر محض رپورٹنگ کرنے والے جب ٹی وی کے اینکر بن کر دانشوری بگھارتے ہیں تو معیار کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں، اب تو دانشوری بھی آٹھ دس اینکر پرسنز کا نام ہے۔ وہ جس موضوع کو اچھال دیں ہمارا میڈیا ادھر دوڑ پڑتا ہے۔ زندگی کے سنجیدہ اہم اور بہت سے عوامی مسائل پر بات کرنے والے خال خال ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب راہ دکھانے والے بندے خود ہی حرص ہوس کے بندے بن جائیں تو راستے متعین کون کرے گا۔

س: لیکن اہلِ قلم میں حبیب جالب جیسا کردار ادا کرنے والے کہاں ہیں؟

ج: حبیب جالب جیسی قناعت، برداشت، صبر اور استقامت، اب اہلِ قلم میں عنقا ہو چکی ہے۔ اب ادب وثقافت میں ایسے سچے کھرے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ ایک کٹھن راستہ ہے۔ اور اس راہ میں چند کڑے مقامات آیا کرتے ہیں۔ آج کی نئی نسل کو بہت جلدی ہے۔ وہ شارٹ کٹ سے جلد ہر منزل حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ نئے تخلیق کار، راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ہر حال میں چاہے اس میں ان کی عزتِ نفس کا جنازہ نکل جائے، شہرت اور دولت کی منزلیں طے کرنے کی فکر میں ہیں۔ جیسا ہمارا معاشرہ ہے اہلِ قلم بھی ویسے ہی ہو نگے۔ قومی سطح پر سنجیدہ روایات، اخلاقیات اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔

س: لیکن ایسا نہیں ہے، بہت سے لوگ ادب میں نام کما رہے ہیں کیا وہ عزت دار نہیں؟

ج: دراصل میں کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اجتماعی زوال کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہوں، دیکھیں عزت اور شہرت میں باریک سا فرق ہے۔ اس کا ادراک ہو جائے تو یار لوگ گم نامی کو زیادہ ترجیح دیں، لیکن یہ شعور بھی تو رب ذوالجلال کی دین ہے۔ جس شاعر کو ہونگ اور داد کا فرق سمجھ نہیں آتا اسے شاعر کون کہے گا؟ شاعری باشعور لوگوں کا کام ہے۔ اگر فہم و ادراک کی طرف سے ہاتھ تنگ ہو تو محض شہرت کے لیے تو کوئی بھی میدان اختیار کیا جا سکتا ہے۔ سو ادب و شعر میں اپنی انا اور عزتِ نفس کو داؤ پر لگائے، خواتین و حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگ اپنی خودداری اور عزت نفس پر توجہ دینے کی بجائے آسائش و آسودگی کے لیے ہانپ رہے ہیں۔

س: آج کل نظم، آزاد نظم سے اگلے پڑاؤ۔۔۔ نثری نظم تک جا پہنچی ہے؟ آپ اسے کیسے لیتے ہیں؟

ج: نظم ایک بھر پور صنف سخن ہے۔ نثری نظم بھی کہنے والے موجود ہیں۔ مگر میری رائے میں نثری نظم کہنے کا حق اسے حاصل ہونا چاہیے جو پابند نظم کہہ سکے یا غزل بھی کہہ سکتا ہو۔ صرف شاعری میں نثری نظم کا لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے مگر بہت سے لوگ وزن میں ایک مصرع نہیں کہہ سکتے مگر وہ نثر میں اپنے آپ کو شاعر کہلوانے پر مصر ہیں۔

س: نثار صاحب کیا انسان اپنی ذات سے بھر پور مکالمہ کر سکتا ہے؟

ذات سے مکالمہ بالکل ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے ایک ''حواس بیدار'' انسان کی ضرورت ہے۔ جو شخص اپنی آواز خود نہیں سن سکتا کہ اس کی زبان سے کیا ادا ہو رہا ہے۔ وہ بیدار مغز کیسے ہو سکتا ہے، خود سے مکالمے کے لیے اپنے آپ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اپنے شب و روز، اپنے کردار اور افعال پر غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ باطنی تربیت کے لیے روز مرہ معمولات کے علاوہ خوراک پر بھی 'فوکس' کرنا لازم ہے۔

س: مشاعرہ کلچر کس مقام پر ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: مشاعرے شعر و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن مشاعرے کو صرف اور صرف تفریح کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے شاعر کو مصرعوں سے ''گدگدی'' کرنا پڑتی ہے۔ جس سے ماحول میں ایک غیر سنجیدگی جنم لیتی ہے۔

مشاعرے کے فروغ میں ٹی وی چینلز خاص کرار ادا کر سکتے ہیں۔ اور پرائم ٹائم میں ایسے مشاعروں کی کوریج سے لوگوں میں شعر و ادب کی دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے اس سے کتاب کلچر کے فروغ میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

ابتدائی زندگی:

میری پیدائش لاہور کے علاقہ امرسدھو میں ہوئی۔ والد صاحب فوج سے ریٹائرمنٹ لے چکے تھے۔ گھریلو ماحول میں کسی حد تک ناچاقی کا عنصر شامل رہا۔ مالی حالات بھی کسمپرسی کا شکار رہتے تھے لیکن ماں نے اور بڑے بہن بھائیوں نے بڑے ہی احسن طریقے سے ان حالات کا مقابلہ کیا اور ہوتے ہوتے ہم لوگ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ گورنمنٹ سکول سے تعلیم حاصل کی اور یوں ان حالات میں میری ماں اور بہن بھائیوں نے ہمارا حوصلہ بڑھایا اور ایم بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ آج امریکہ میں رہتے ہوئے دل میں شدید خواہش ہے کہ لاہور کے وہ علاقہ دیکھنے جاؤں جہاں بچپن گزرا۔

س: آپ کے افسانوں میں شدید کرب، دکھ اور اُداسی پائی جاتی ہے؟

ج: مجھے کچھ چیزیں اندر سے ہلا دیتی ہیں۔ کرب، دکھ، اداسی لکھنا جیسے مشکل ہے اک درد سے گزرنا اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے۔ پھر جب اتنا تلخ سفر کر کے آپ کچھ لکھتے ہیں تو درد تو آ ہی جاتا ہے۔ میری پہلی شادی بیس دن کے لیے تھی۔ جن حالات میں شادی ہوئی، ٹوٹی وہ میرا درد تھے۔ میری تکلیف تھی۔ مجھے اس بات کا اندازہ طلاق کے بعد ہوا کہ ایسی خبریں کیسے زبانِ زد عام ہوتی ہیں۔ مجھے لگا کہ لوگوں کو آپ کی اذیت بھی چسکہ لگتی ہے۔ انہیں آپ کو درد میں دیکھ کر بھی لطف آتا ہے۔ طلاق ہوئی تو ٹوٹ گئی لیکن پھر ڈٹ گئی۔ چٹان بننے لگی۔ ایک بہت ہی بڑے ادارے میں اپنے پاؤں جمانے لگی تو ملازمت سے نکال دیا گیا۔ جل گئی، خاک ہونے لگی لیکن نہ جانے کیسی ڈھیٹ ہوں کہ ہر بار اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ خدا کی شاید خاص مہربانی ہے۔ طلاق کے بعد دوران ملازمت فون پر میسج آیا کہ Divorce how

س: آپ شاعری بھی کرتی ہیں، کالم بھی لکھتی ہیں۔

ج: افسانہ بھی پسندیدہ صنف ہے۔ مجھے افسانہ لکھنے میں لطف آتا ہے۔ کالم تو ایک نوکری کی طرح ہے۔ شاعری تو آمد ہے۔ جب بھی کہیں آمد ہوئی قلم اُٹھالیا۔

س: امریکہ میں زندگی کیسی ہے، کیا سب لوگ خوشحال ہیں؟

ج: یہاں زندگی بڑی مشینی ہے اور انسان جذبات سے عاری۔ یہاں پر بھی وہی لوگ خوش حال ہیں جو دن رات کام کرتے ہیں اور یقین کیجیے یہاں کام کے سوا گزارہ بھی نہیں۔ کام نہ کریں تو عزت سے نہیں لوگ تنہائی سے مرجائیں گے۔

س: زندگی کیا ہے؟

ج: مجھے لگتا ہے کہ شاید زندگی ایک بہروپیا ہے۔ کبھی اتنی حسین لگنے لگی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اسے اور قریب سے دیکھا جائے۔ بار بار دیکھا جائے اور کبھی اتنی بھیانک کہ سانس بند ہونے لگتی ہے۔ جان نکلنے لگتی ہے۔

س: مستقبل میں زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟

ج: ''واہگہ'' نام سے ایک ادارہ بنایا ہے۔ کوشش ہے اس پلیٹ فارم سے کچھ تخلیقی کام کروں۔ کچھ لوگوں سے بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں جو اللہ کو منظور۔

س: ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج: مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عید کے دن تھے اور ٹی وی پر ایک مزاحیہ مشاعرہ چل رہا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ یوں تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔ کہہ سکتی ہوں۔ جھٹ سے ایک نظم لکھی جو اپنی مرحومہ بہن روبینہ کوثر جعفری کے ذریعہ نظم مرحوم سیّد ضمیر جعفری صاحب کو بھجوائی جو ملازمت کے حوالے سے ان کو جانتے تھے یا غالباً انہی کے دفتر میں ملازم تھے (ڈھنگ سے یاد نہیں) انہوں نے خوب حوصلہ افزائی کی۔ پھر ''نونہال'' میں لکھنے لگی تو مرحوم حکیم محمد سعید صاحب کی طرف سے کتابوں کے تحائف وصول ہوئے۔ بس یوں سلسلہ چلتا رہا۔ ''نوائے وقت'' میں خواتین کے ایڈیشن کے لیے کچھ کالم لکھے۔

میرے دادا صاحب جن سے میری ملاقات نہ ہوسکی، بھی لکھتے تھے۔

س: کیا ادبی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں۔ مشاعروں میں جا کر کیسا لگتا ہے؟

ج: ادبی تقریبات میں شرکت بہت محدود ہو چکی ہے۔ یہاں تقریبات میں شرکت کے لیے emails آتی ہیں۔ ہم دیسی لوگوں کو جب تک اپنائیت سے فون کر کے بلایا نہ جائے، جانا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی عظم ابھی 5 سال کے ہیں۔ مشکل ہے عظم اور پھر کاروبار اور گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ تقریبات میں جانا۔

س: پاکستان سے دبئی، دبئی سے امریکہ داستان؟

ج: 2006 میں پاکستان سے بسلسلہ ملازمت یو اے ای منتقل ہوگئی اور قسمت 2012ء میں امریکہ لے آئی اور جب سے کیلیفورنیا میں مقیم ہوں مجھے لگتا ہے کہ آپ کا اپنے سفر کے فیصلوں پر تو کیا کسی بھی فیصلہ پر اختیار نہیں۔ جب 2012 میں امریکہ آئی تو بظاہر علاج کے لیے آئی اور اُمید تھی کہ علاج کے بعد دوبارہ یو اے ای چلی جاؤں گی لیکن بابا جی کہتے ہیں کہ دیوار کے پیچھے کیا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کو پتہ ہے۔

مختصر ادبی خبریں

✦ نقوی احمد پوری کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''سورج کا سفر'' کی تقریب پذیرائی اسلام آباد میں ہوئی جس کا اہتمام بزمِ ارمغان ادب نے کیا۔ اس کتاب کو ساجد درانی نے مرتب کیا۔ صدارت نسیم سحر نے جبکہ مہمانِ خصوصی رومانہ رومی تھیں۔

✦ کشمیر مشاعرہ ۲۰۱۸ء مظفر آباد میں ۲۵ را پریل کو منعقد ہوا۔ یہ ڈاکٹر صابر آفاقی اور ڈاکٹر مختار مغل کی یاد میں منعقد ہوا جس میں امجد اسلام امجد، عباس تابش، قمر رضا شہزاد، محبوب ظفر، احمد حسین مجاہد، شوکت فہمی، کبیر اطہر، شاہد زمان اور علی یاسر کے علاوہ بہت سے شعرا نے شرکت کی۔

✦ ادبی تنظیم ''شفق'' کے زیر اہتمام سیالکوٹ میں مشاعرہ۔

✦ خواجہ فرید گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں پہلا سالانہ محفل مشاعرہ ۱۹ را پریل کو منعقد ہوئی جس میں پروفیسر نواز کاوش کی کتب ''سراب موسم'' اور ''پارتاں'' کی تقریب رونمائی ہوئی۔ کتاب کی تقریب کی صدارت اسلم ادیب اور محفل مشاعرہ کی صدارت منصور آفاق نے کی۔ مہمانانِ خصوصی اعجاز توکل، نوید رضا، اظہر فراغ، بدر سیماب، بشریٰ ناز اور ارشد نعیم تھے۔ اہتمام نوجوان شاعر شہباز نیر نے کیا۔

✦ بزم فکر وفن کے زیر اہتمام ایف سی کالج میں مشاعرہ کا انعقاد لاہور میں ہوا۔

✦ انصار ادب ملتان کے زیر اہتمام منفرد لب و لہجے کے شاعر بدر سیماب کے ساتھ ۲۲ را پریل کو ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔

✦ بزمِ چغتائی لاہور کے زیر اہتمام ماہنامہ محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز آرٹ اینڈ کلچر کے زیر اہتمام نامور کالم نویس اور صحافی ایثار رانا کے ساتھ ایک شام کا اہتمام ۱۲ را پریل کو پلاک میں کیا گیا۔

✦ محکمہ اطلاعات و ثقافت، ایف ایم ۹۵ اور پلاک کے زیر اہتمام میلہ خواجہ غلام فرید ۲۸ را پریل کو ملتان میں منعقد ہوا۔

✦ بزم پرنم کے زیر اہتمام استاد شاعر حضرت پرنم الہ آبادی کی ۹ ویں برسی کی شاندار تقریب پلاک میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت اختر شمار نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈائریکٹر جنرل پلاک ڈاکٹر صغریٰ صدف تھیں۔ تقریب میں ملک کے نامور فن کاروں اور گلوکاروں نے شرکت کی۔ یہ برسی بزم پرنم کے چیئرمین اور پرنم الہ آبادی کے شاگرد اقبال پیام ہر سال منعقد کرتے ہیں۔

✦ نیشنل بک فاؤنڈیشن کا سالانہ کتاب میلہ اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے مقبول اشاعتی اداروں نے بک اسٹال لگائے۔ اس کے علاوہ نامور شاعروں ادیبوں نے شرکت بھی کی۔

✦ عالمی ادبی تنظیم ادارۂ خیال وفن لاہور کے زیر اہتمام یکم مارچ ۲۰۱۸ء کو اکادمی ادبیات گلبرگ لاہور میں معروف شاعر کفایت حسین اعوان کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ صدارت: حسین مجروح، مہمانانِ خصوصی: اقبال راہی، توقیر احمد شرفی، تاثیر رضا نقوی، حکیم سلیم اختر اور ڈاکٹر طارق قمری (رینالہ خورد)، نظامت صدر ادارۂ خیال وفن اور نامور شاعر ممتاز راشد لاہوری نے کی۔

✦ عالمی ادبی تنظیم ''ادارۂ خیال وفن'' لاہور نے ''پلاک'' کے اشتراک کے ساتھ ۱۴ مارچ ۲۰۱۸ء کو ''پلاک ہال نمبر ۲'' میں ایک ادبی سیمینار منعقد کیا۔ موضوع تھا ''ادبی رسائل کی اہمیت اور معیار'' صدارت: سعید جمال، مہمانانِ خصوصی نذیر قیصر، ڈاکٹر صغریٰ صدف (ڈی جی ''پلاک'') نسیم شاہد (ملتان)، پروفیسر عبدالکریم خالد، ارشد نعیم (شیخوپورہ)، بینا گوئندی (امریکہ) اور حکیم سلیم اختر ملک، مہمان اعزاز تھے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: کعبہ لے چلو/شاعر: ڈاکٹر اخلاق گیلانی/صفحات: 232/ قیمت: 400/تبصرہ نگار: ڈاکٹر عزیز احسن
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور

میں نے اخلاق گیلانی کی کتاب کا مسوّدہ لوح سے تمت تک پڑھا اور اس کی قرأت کے توسط سے فکری، احساساتی اور شعری روایت کے ہمہ رنگ عکس دیکھے ہیں۔ حمدیہ شاعری کے جتنے زاویے ہو سکتے ہیں ان میں سے بیشتر ''کعبہ لے چلو'' میں متنوع آہنگ اور بوقلموں انداز سے اظہار میں آگئے ہیں۔ سب سے اہم بات، کہ اخلاق گیلانی نے صرف شاعری نہیں کی ہے بلکہ اپنی روحانی واردات کا عکس اتارتے ہوئے لفظ لفظ کو آتش عشق کی تپش بھی دی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کی تابندگی میں گونا گوں اضافہ ہو گیا ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر اخلاق گیلانی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حمدیہ کاوش قبول فرمائے اور ان کے اشعار کے ذریعے عشق حقیقی کی حرارت عام کر دے!...... آمین بجاہ سید الامین محمد مصطفیٰ ﷺ!

نام کتاب: شہر خواب سے آگے/شاعر: عدیل احمد آسی/صفحات: 200/ قیمت: 400/ بیک فلیپ کتاب: عطاء الحق قاسمی
ناشر: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور

میں نے عدیل احمد آسی کے پہلے شعری مجموعے ''شہر خواب سے آگے'' کا مطالعہ کیا ہے۔ اُس کی شاعری میں انسانیت، خاص کر امت مسلمہ کی زبوں حالی کے حوالے سے کافی تشویش پائی جاتی ہے۔ وہ عالم اسلام اور پاکستان کے دگرگوں حالات کے حوالے سے بھی گہرا دکھ رکھتا ہے اور اس نے اپنے جذبات و احساسات کو نہایت خوب صورت انداز میں شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اس کی شاعری میں اس کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور بحیثیت قوم ہم جتنے مادہ پرست اور دنیادار ہو چکے ہیں اس حوالے سے بھی مجھے عدیل کی اصلاحی شاعری اچھی لگی ہے۔ اس نوجوان کے لیے بہت سی دُعائیں۔

نام کتاب: غروب قلب/شاعر: سہیل ثانی/صفحات: 200/ قیمت: 400/تبصرہ نگار: غلام حسن ساجد
ناشر: زربفت پبلی کیشنز، لاہور

سہیل ثانی کی غزلوں کی صفت ان کی بے ساختگی، سادگی، روانی اور روایت سے گہری وابستگی ہے۔ انہوں نے موجود سے وابستگی اور عہد حاضر کے فشار کی ترجمانی کے لیے غزل کے کلاسیکی مزاج کو ترک کیا ہے نہ ہی زبان و بیان میں کسی نوع کی پیچیدگی اور لسانی تجربیت کو پروان چڑھایا ہے۔ ان کی غزل پڑھتے ہوئے ہم اپنے آپ کو غزل کی اسی مانوس فضا کا حصہ محسوس کرتے ہیں جو میر و مصحفی سے ناصر کاظمی اور احمد مشتاق تک ایک دلفریب ورثے کے طور پر ہمارے حصے میں آئی ہے اور جس کی طاقت اور حقانیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ سہیل ثانی نے بھی بولتی ہوئی زمینوں اور شگفتہ ہوتے ہوئے قافیوں میں آج کے طرز احساس کو بڑی سہولت سے سمویا ہے اور یوں اس کی غزل ایک دلفریب جمال کے ساتھ دلوں کو فتح کرنے میں کامیاب ہے۔

نامہ ہائے احباب

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

تسلیمات! ''ارژنگ'' کا مارچ کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ اس محبت کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ میری رباعیات اور غلام اصغر طاہر کی حمد کو آپ نے اس شمارے میں پذیرائی بخشی۔ دُعا کی صورت میں کچھ اشعار ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔

خیراندیش

مظفرحسن منصور

بہت عزیز محترم حسن عباسی صاحب!

سلامت رہیں۔ آپ کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ ارژنگ کی ترسیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیاں عطا فرمائے۔

یوں تو آپ نے ارژنگ کو ادب کے اعتبار سے نہایت باثروت بنایا ہوا ہے۔ مگر یہ جو ''مختصر ادبی خبریں'' کا سلسلہ ہے یہ نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ اس سے مجھ جیسے دور افتادہ کو بھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

تازہ ارژنگ کے ان ہی خبروں میں ایک خبر ''ساہی وال کے معروف شاعر غضنفر عباس سیّد کی رحلت کی خبر پڑھ کر مجھے رنج ہوا۔ یوں تو کبھی وفات پانے والوں پر رنج ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ مگر اس نام سے ملتے جلتے نام کے ایک شاعر جو بہت مدت پہلے P.M.A کاکول (اکیڈمی) میں میجر تھے پھر ان کے تبادلے دوسرے مقامات پر ہوتے رہے۔ پھر ان سے کبھی کبھار رابطہ ہوتا رہا۔ پھر معلوم ہوا اُن کو کینسر ہوگیا اور اُن کی ٹانگ کاٹنا پڑی۔ پھر وہ کراچی بھی گئے۔ مجھے صبح صبح دُعائیہ میسج بھیجا کرتے تھے۔ پھر رابطہ منقطع ہوگیا۔ غالباً دو ہفتے پہلے اچانک ان سے فون پر رابطہ ہوگیا تو انہوں نے سندھ میں کسی جگہ کا نام بتایا کہ آج کل وہاں ہیں۔

ان کا نام غضنفر عباس قیصر فاروقی تھا۔ جب تک کاکول میں رہے اکثر اپنے گھر میں مشاعرے منعقد کرواتے رہے جس میں مجھ سمیت سب دوست شامل ہوئے۔

اللہ نہ کرے مگر مجھے شک سا ہو رہا ہے کہ یہ وہی تو نہیں ہیں ان کا ایک بیٹا فوج میں تھا بقول ان کے۔

کیا آپ میرا یہ مغالطہ رفع کر سکتے ہیں۔ بہت شکریہ!!

نیازت علی نیاز صاحب سے اگر ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دیں۔ شکریہ

والسلام/ دعاگو

سلطان سکون

محترم حسن عباسی صاحب (مدیر''ارژنگ''لاہور)

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' ملتا رہتا ہے جس کے لیے حد ممنون ہوں۔ مارچ 2018ء کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ نامور شاعر غلام حسین ساجد سے عامر بن علی کی گفتگو اس شمارے کا بہت اہم حصہ تھی۔ یونس وریام کے سفرنامہ ''کلنگ سے لنکاوی'' پر مضمون بھی خوب تھا۔ منو بھائی کی رحلت پر عامر بن علی کا تعزیتی مضمون بھی خاصا پر اثر تھا۔ اسلام عظمی نے ''پھلواری'' پر جو مضمون لکھا تھا اس کا بھی جواب نہیں۔ راجا نیر کا فن پارہ اس شمارے کا ٹائٹل بنا۔ اس شمارے میں ان کے بارے میں اقرا شوکت کا مضمون بھی تھا۔ دونوں خوب رہے۔ حسب معمول شاعری کے صفحات بھی خوب تھے۔ 'مختصر ادبی خبریں' سمٹ کر ایک صفحے پر آ گئیں۔ چلیں یہ بھی ٹھیک ہے کہ رفتار ادب کا کچھ تو اندازہ ہوا۔ اختصار میں بھی دو ایک پہلو پیش نظر رہنے چاہئیں۔ مثلاً اعجاز اللہ ناز کے ساتھ شام ''ادارۂ خیال و فن'' نے منائی تھی جس کا ذکر نہ ہوا۔ اسی طرح اختر ہاشمی کے ساتھ شام بھی ''ادارۂ خیال و فن'' لاہور نے منائی تھی۔ ان دونوں تقریبات کے ساتھ ''ادارۂ خیال و فن'' کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ اُمید ہے آئندہ اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔ ''ارژنگ'' کے زیر تبصرہ شمارے کے بیک ٹائٹل پر جم خانہ کلب لاہور میں منعقدہ ''شامِ عامر بن علی'' کی تصاویر بہت خوب تھیں۔ لاہور رائٹرز کلب کی یہ تقریب بھی خوب تھی اور روداد بھی۔ میری نیک تمنائیں ''ارژنگ'' کے سبھی بہی خواہوں کے لیے۔

خیراندیش

ممتاز راشد لاہوری/ لاہور

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ارژنگ موصول ہوگیا۔شکریہ!! عمدہ تحریروں سے مالا مال انٹرویو کا سلسلہ تو بہت اچھا ہے۔ افسانے خصوصاً پسند آئے اور شعرا کی عزت افزائی بھی اچھی لگی۔

آپ کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔سلامت رہیے

آسناتھ کنول/لاہور

قابل احترام عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ پہلے بھی ڈاک بھجوائی ہے یقیناً ملی ہوگی۔ مزید کچھ چیزیں ارژنگ کے لیے ارسال خدمت ہیں۔ تمام غیر مطبوعہ ہیں۔ سلام زیادہ ہیں اگر گوشہ لگ جائے تو خوشی ہوگی۔ جیسے آپ بہتر سمجھیں۔سب کو سلام

مخلص

ریاض ندیم نیازی

سبی

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ بہت دنوں کے بعد''ارژنگ'' کے لیے اپنی تازہ غزل مع اپنے عزیز امان اللہ جاذب کی ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرمایئے۔

اسد اعوان

جھنگ روڈ/ساہیوال

عزیزم عامر بن علی مدیراعلیٰ ارژنگ،لاہور

السلام علیکم۔اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔آپ کا ادبی وعلمی اور روحانی وعرفانی ماہنامہ ارژنگ باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ ادبی شاہکار تلاش کر کے زیور اشاعت سے چمکانے پر قابل تبریک وتہنیت ہیں۔ اس کاوش میں آپ کے عالمی روابط قابل تعریف ہیں۔ دور دراز سکول میں اردو ادب کی ترویج وترقی کے لیے دھڑکنے والے دلوں کے شاہپارے نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔آپ کی تصوری حسن آفرینیاں اور ادب پارے یادوں کے جھروکوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔میاں چنوں کا یہ سپوت اور ہمارا پیارا عزیز واقعتاً خوبصورت لگتا ہے۔

آپ اگر مناسب سمجھیں تو چند اوراق جن پر راقم نے کچھ لکھا ہے ان کو اپنے رسالہ میں شرف اشاعت دے کر ممنون فرمائیں۔آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا سوائے تعریف وتحسین کے۔ پرسانِ حال کو سلام۔

آپ کی ادبی دنیا اسی طرح ادبی آسمان کو چھوتی رہے۔

والسلام

شفقت حسین نقوی

میاں چنوں

مکرم ومحترم خوشنما دانشور ادیب وشاعر

جناب حسن محمود عباسی صاحب!

سلام مسنون۔دعائیں،تسلیمات،آداب

عریضہ احوال آپ کا مزاج خیریت مطلوب ہے۔ جونہی ارژنگ نظر نواز ہوتا ہے اس میں بندۂ ناچیز کی کوئی نہ کوئی چیز نعت، حمد، مضمون شامل اشاعت ہوتا ہے تو آپ کی کرم فرمائیاں اور شفقت آرائیاں ماضی اور حال کے جھروکوں میں رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔شکریہ کے لیے الفاظ دامن گیر ہوتے ہیں تو مدعا بیان کرنے کے لیے تہی دامن ہو کے رہ جاتا ہوں۔

ارژنگ اس وقت ادبی دنیا میں پہلے نمبر پر کہہ دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر طرح سے رکھ رکھاؤ کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

میری طرح ہر قاری جب نثری تحریروں میں گم ہوتا ہے تو بیرونِ ملک کی سیر کرتے کرتے بہت کچھ حاصل کرتا ہے اور یہ کمال''ارژنگ'' کو ہی حاصل ہے۔

جناب حسن صاحب! اپنی نئی کتاب آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ایک مضمون بھی ارسال خدمت ہے۔جس سے جناب رشید عثمانی صاحب کی یاد تازہ ہو جائے گی۔

آپ کی کتاب''سائیں'' پر ایک فنی لحاظ سے مضمون عنقریب ارسال کروں گا۔

ثانی الذکر حضرت علیؑ کے اسم''علی'' کے المداد ۱۰۰ کی نسبت سے ۱۱۰ بند چھوٹی بحر میں لکھتے ہیں۔

اگلے مہینے میں ان کی ولادت ہے۔رجب المرجب کے حوالے سے بھیج رہا ہوں اُمید ہے دو تین قسطوں میں ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے جہاں ضرورت ہو تو ضرور نوک پلک بھی سنواریں۔

انہی الفاظ پر اختتام کی دہلیز پر آتے ہوئے خدا حافظ کہتا ہوں۔

محمد امین ساجد سعیدی

حاصل پور

کالم تو ایک نوکری کی طرح ہے۔
شاعری تو آمد ہے۔
جب بھی کہیں آمد ہوئی قلم اُٹھالیا۔

امریکہ میں مقیم نامور
افسانہ نویس، کالم نگار اور شاعرہ

انیلہ بُھلّر

سے مدیر ارژنگ کی گفتگو

امریکہ میں رہتے ہوئے دل میں شدید خواہش ہے کہ لاہور کا وہ علاقہ دیکھنے جاؤں جہاں بچپن گزرا۔

امریکہ میں کام نہ کریں تو عزت سے نہیں لوگ تنہائی سے مرجائیں گے۔

انیلہ بھلر معروف شاعرہ، ممتاز افسانہ نویس اور کالم نگار ہیں۔ ان کی جنم بھومی لاہور ہے۔ بچپن میں والدین کے ہمراہ اسلام آباد منتقل ہونا پڑا۔ اسی شہر میں ایم بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتی رہیں۔ ہالیڈے ان اسلام آباد میں بطور پبلیک ریلیشن آفیسر خدمات سر انجام دیں۔ بعد میں میریٹ ہوٹل اسلام آباد کے سیلز ڈیپارٹمنٹ کو جوائن کیا۔ 2006ء میں بسلسلہ ملازمت متحدہ عرب امارات چلی گئیں۔ وہاں پہلے گولڈن ٹیولپ میں اور بعد میں میلینیم ہوٹل ابوظہبی کے شعبوں سیلز اینڈ مارکیٹنگ اور فوڈز اینڈ بیوریجز میں بطور سیلز منیجر کام کیا۔ ادبی ذوق کی تسکین کے لیے نہ صرف خود متحدہ عرب

باباجی کہتے ہیں کہ دیوار کے پیچھے کیا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کو پتہ ہے۔

امارات میں مشاعروں کا انعقاد کرایا بلکہ امریکہ اور قطر کے عالمی مشاعروں میں شرکت بھی کی۔ بطور کالم نویس خواتین کے حوالے سے نیویارک کے مختلف اخباروں کے علاوہ نوائے وقت (پاکستان) میں بھی کالم لکھتی رہیں۔ بطور منتظم، پاکستان اور بیرون ملک کئی مشاعروں فوڈ فیسٹولز اور فیشن شوز کا کامیاب انعقاد کرایا۔ میوزک، آرٹ اور فلم سے دلچسپی کے باعث مستقبل میں اس شعبہ میں کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ڈریس ڈیزائننگ کے شعبہ میں کمال مہارت رکھنے کے باعث آج کل امریکہ میں بوتیک کا کاروبار نہایت کامیابی سے چلا رہی ہیں۔

انٹرویو اندرونی صفحات پر

امریکہ میں مقیم نامور شاعر، ادیب اور دانشور خالد خواجہ کی

پاکستان آمد اور دورۂ میاں چنوں کی تصویری جھلکیاں

فاروق طراز، خالد خواجہ، غلام حسین ساجد اور عامر بن علی رسمی گفتگو کے دوران

خالد خواجہ کے اعزاز میں غزل میرج ہال میں مشاعرے کے اسٹیج کا منظر

شعرائے کرام کا گروپ فوٹو

شعرائے کرام کا گروپ فوٹو

تقریب کے سامعین کی تصویر

عامر بن علی کی رہائش گاہ پر ظہرانہ کے موقع پر لی گئی تصویر

عامر بن علی اپنی تازہ کتاب ''جہاں گردی،، خالد خواجہ کو پیش کر رہے ہیں

لاہور ڈیفنس کلب میں عامر بن علی کے اعزاز میں رخشندہ نوید کا عصرانہ

معروف ادباء وشعراء امیر اختر جعفری، فرحت زاہد، نیلم احمد بشیر، سلمیٰ اعوان اور سیما پیروز مہمانوں میں نمایاں ہیں

Design By: MUHAMMAD AHSUN 0300-4528821 Gull